توحید اور پیام توحید

تالیف: ڈاکٹر محمد ایوب شاہد

ایم اے گولڈ میڈلسٹ، پی ایچ ڈی

تحقیق ونظر ثانی: حافظ تنویر الاسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

DARULIBLAGH
دارالابلاغ

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

توحید اور پیامبر توحید

تالیف .... ڈاکٹر محمد ایوب شاہد
ایم اے گولڈ میڈلسٹ، پی ایچ ڈی

تحقیق و نظر ثانی .... حافظ تنویر الاسلام

اشاعت اول .... ستمبر 2013ء

- لاہور۔ البلاغ (جیل روڈ 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن 35942233)
- راولپنڈی۔ تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168 دار الفکر اسلامی 0321-5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075
- اسلام آباد۔ المسعود اسلامک بکس 2261356 البلاغ 2281420 دارالسلام شوروم 0321-5370378
الہدیٰ انٹرنیشنل 4434615, 0321-8014008 • کراچی۔ فضلی سنز 32212991 علمی کتب خانہ 32628939
- فیصل آباد۔ مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار، 631204۔ مکتبۃ الحدیث امین پور بازار 0300-6628021
- پشاور۔ معراج کتب خانہ 214720۔ • واہ کینٹ: البلاغ 051-4541148

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4453358, 042-37361428

ضروری نوٹ: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور انسانی بساط و طاقت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ خاص طور پر عربی عبارات میں تصحیح اغلاط میں پوری طرح احتیاط کی ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

فہرستِ مضامین

باب 1

...... لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ......

باب 2

... لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ ...

باب 3

وحدت الشّہود

باب 4

وسیلہ

باب 5

محمد رسول اللہ ﷺ

باب 6

حقیقت اولیٰ

پیش لفظ:

توحید کی خاطر برسر پیکار رہیں گے

انسان کے ساتھ ''ہونے'' کا لزوم دائمی ہے، یہ جو مثل مشہور ہے کہ ''انسان فانی ہے'' اگر درست ہوتی اور انسان فنا ہوکر معدوم ہوجاتا تو اُسے ایک بڑے دن کے عذاب کا سامنا نہ کرنا پڑتا جس دن بقول قرآن حکیم ''لوگ تجھے نشے میں معلوم ہوں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے (بلکہ اللہ کا) عذاب دیکھ کر مدہوش ہورہے ہوں گے۔''❶

''ہونے'' کی اِس ابدیت سے انسان پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ آن پڑا ہے اور اب اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ اگر وہ اپنے 'ہونے' کا ابدی شعور رکھتا ہے تو اسے کسی ایسے لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو اس کی ''ابدیت'' کو محفوظ بنا سکے۔ اسلام وہ واحد لائحہ عمل ہے جو حیات بعد الممات کے شعور کے ساتھ ساتھ اُس کو مثبت نتائج سے ہمکنار کرنے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔

توحید اور رسالت اس لائحہ عمل کے دو بنیادی اجزا ہیں۔ جن کو صحت کے ساتھ قبولنے اور نتیجہ کے طور پر ان کو عملی زندگی میں نافذ کرنے سے اُس مقصدِ عظیم کو حاصل کیا جاسکتا ہے جسے ''اُخروی کامیابی'' کہا جاتا ہے۔ توحید، حیات و کائنات کی تخلیق کا مقصد اولین و آخرین ہے اور اس کا صرف ایک تقاضا ہے کہ جن و انس اپنے جملہ مراسمِ عبودیت صرف اور صرف ایک اللہ کے لیے خالص کرلیں اور ایک مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر دن میں بیسوں مرتبہ اس کا اعلان کرتا ہے کہ ''اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ'' یعنی ''میری قولی، بدنی اور مالی (ساری) عبادات صرف اللہ کے لیے ہیں'' بلکہ قرآن حکیم نے بھی تو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے وہ کلمات ادا کروائے کہ جنہوں پوری انسانی زندگی کو مرکزیتِ الٰہی کے تابع کردیا:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿١٦٣﴾﴾ ❷

''آپ کہہ دیجیے کہ بلاشبہ میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب خاص اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔''

---

❶ الحج: ٢٢/ ٢۔ ❷ الانعام: ٦/ ١٦٢ تا ١٦٣۔

بات نہایت واضح ہے کہ جملہ مراسمِ عبودیت کو صرف اللہ سے خاص کرتے ہوئے شرک کی نفی کی گئی اور تمام انبیاء ﷩ کا مقصدِ بعثت بس یہی تھا کہ وہ انسانوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں دے دیں۔

دوسری طرف یہ توحید ہی ہے جو تمام انبیاء ﷩ کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر لازم کرتی ہے۔توحید کے ساتھ رسالت کی لازمیت کا تصور اس درجہ پر ہے کہ ایک کے بغیر دوسری کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ توحیدِ الٰہی تک رسائی کا واحد وسیلہ، رسولوں کی اطاعت و پیروی ہے، تمام انبیاء ﷩ نے اپنے اپنے ادوار میں اللہ اور بندوں کے درمیان، دوسرے تمام واسطے و وسیلے ختم کرنے کی کوشش کی، اللہ اور بندہ کا براہِ راست تعلق قائم کردیا۔

محمد ﷺ ،عمارتِ نبوت کی آخری اینٹ ہیں اور اب قیامت تک صرف آپ ﷺ کی اطاعت ہی قربِ خداوندی کا واحد آخری وسیلہ ہے۔ "فَاتَّبِعُوْنِیْ" اس پر دلالت کناں ہے۔لہٰذا اس اطاعت کو بھی اُسی طرح خالص کرنا ہوگا جس طرح توحید خالص مطلوب ہے۔ سیّدنا محمد ﷺ کی اطاعت کو بھی کسی غیر نبی کی اطاعت سے مشروط نہیں کیا جاسکتا۔کوئی فقیہ، محدث یا مجتہد، نبی ﷺ پر حَکَم (فیصل) نہیں ہوسکتا کہ صرف اُسی کے وسیلے سے اطاعتِ رسول ﷺ کی جائے۔ تمام مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کا پابند کیا ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہمہ وقت، ہمہ تن اور ہمہ جہت اطاعتِ رسول ﷺ کے لیے فرمانِ رسول ﷺ (حدیث) کا متلاشی رہے اور اپنے آپ کو صرف نبی پاک ﷺ کا پابند خیال کرے ۔باقی جو بھی ہو اگر وہ فرمانِ نبوت کے مطابق ہے تو قابلِ قبول ورنہ قابلِ رد ہے۔ جہاں تک قولِ رسول ﷺ کی صحت وعدمِ صحت کا مسئلہ ہے تو عامی پر سوال و استفسار لازم ہے، اطاعتِ رسول ﷺ تک رسائی کے لیے اپنی علمی و عملی قوت استعمال کرے۔ ماضی میں بھی جن افرادِ امت نے یہ عظیم فریضہ سرانجام دیا وہ سارے ہمارے اپنے اسلاف ہیں، مزید یہ کہ کسی ایک نے بھی اطاعتِ رسول کے لیے اپنے آپ کو لازم نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اصل مقصد اطاعتِ رسول ﷺ ہے۔ جو غیر رسول کے متعین وسیلہ کو لازم کرنے میں مانع ہے۔ علومِ نبوت کا احاطہ کسی ایک فرد کے لیے ممکن نہیں لہٰذا ہر ایک اپنے اپنے عہد میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق اِس کارِ خیر میں حصہ ڈالتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا طالب رہا جو کہ آخری مقصود ہے۔

کتاب ہذا بھی نبی پاک ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تحریر کی گئی ہے جس میں تین چیزوں کو صدقہ جاریہ قرار دیا گیا، جن میں سے ایک علمِ نافع ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب وہی نہایت مشکل کام ہے، ایسا مشکل امر کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے عظیم صحابی کہ جن کے راستے سے شیطان تک

بھاگ جاتا تھا''تنکا'' ہونے کی خواہش کرتے رہے، پھر ہماری کیا اوقات ہے! بس اللہ تعالیٰ کے سامنے نہایت عجز وانکسار اور ڈرتے ڈرتے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان میں یہی التجا کر سکتے ہیں: فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۱۱۸﴾ ❶

''اگر تُو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تُو اِن کو معاف فرمادے تو تُو زبردست اور حکمت والا ہے۔''

تاہم دوسری طرف ہم اِس اعزاز کا دامن بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ہمیں (مجھ ایسے گنہگاروں کو) ''اپنا بندہ'' قرار دے کر اپنی رحمت سے لو لگائے رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے فرما رہا ہے:

﴿قُلۡ يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ﴾ ❷

''اے میرے گنہگار بندو! میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ بے شک اللہ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

اے اللہ! ہم کیوں مایوس ہوں گے، ہم جانتے ہیں کہ تُو بڑی طاقتوں اور قوتوں والا ہے۔ دونوں جہانوں میں بلاشرکتِ غیرے حکمران ہے، تُو دردناک عذاب دینے والا ہے مگر ہم تیرے باغی نہیں، بندے ہیں، غلام ہیں۔ جن کی اپنی مرضی نہیں ہوتی۔ وہ دانستہ تیری نافرمانی نہیں کرتے، نہ کسی اور کی غلامی قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ تُو رحم کرنے والا ہے اور نہ صرف رحم کرنے والا بلکہ تُو وہ ذات ہے جسے کوئی پابند کرنے والا نہیں، جس پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، کیا ہمارے لیے اپنے آپ کو پابند نہیں کر چکا؟ ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ؕ﴾ (المائدہ ۵/ ۱۲) اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ اے اللہ! ہم اِسی رحمت کے طلب گار اور اُمیدوار ہیں۔ اے اللہ! قیامت والے دن ہمیں عذابِ الیم سے بچا لے اور رسول پاک ﷺ کی شفاعت ❸ کا حق دار بنا۔ اے اللہ! میری طرف سے اور تمام

---

❶ الانعام: ۶/ ۱۱۸۔ ❷ الزمر: ۳۹/ ۵۳۔

❸ راول پنڈی میں ایک صاحب سے بحث کے دوران سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی درخواست یعنی ''اگر تُو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تُو اِن کو معاف کردے تو تُو زبردست اور حکمت والا ہے'' کے جواب میں ⇦⇦

پڑھنے پڑھانے والوں کی طرف سے کتاب ہذا کو قبول فرما اور اِس میں جو غلطی کوتاہی ہے اُسے دور کرنے کی توفیق عطا فرما اور معاف فرما کہ تیرے سوا اور معاف فرمانے کی طاقت بھی کس میں ہے؟

⇐⇐ اللہ ارشاد فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو سچائی ہی نفع دے گی۔'' کو ردِ شفاعت کے لیے استعمال کیا کہ آج (قیامت) صرف راست باز انسان اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں جائیں گے۔

ایک عمومی اصول کے طور پر اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عملِ صالح کو کامیابی کے لیے لازمی قرار دیا ہے لیکن یہ بات بھی علمی طور پر طے ہے کہ کوئی بھی اصول اپنے عموم پر اُسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اُس میں استثناء متعارف نہ کروائی جائے، جب استثناء یا تخصیص لائی جاتی ہے، مطلق اپنے محل پر قائم نہیں رہتا۔ قرآن حکیم میں ہے کہ ''تمام شفاعت اللہ کے لیے ہے'' (۳۹/ ۴۴) مگر پھر خود ہی اللہ تعالیٰ استثناء لاتے ہیں کہ اللہ کے اِذن (اجازت) سے شفاعت کا حق دوسروں کو بھی دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ جس کی بات کو پسند کرے گا، قبول کرے گا۔ تفصیل کے لیے قرآن مجید کی درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں: (۱۹/ ۸۷، ۲۰/ ۱۰۹، ۳۴/ ۲۳، ۴۳/ ۸۶، ۱۰/ ۳، ۲/ ۲۵۵)

اب یہ ظاہر ہے کہ شفاعت، ایمان اور عملِ صالح سے زائد چیز ہے۔ اگر ایک شخص اپنی کارکردگی کی بنیاد پر کسی شے کا مستحق ہو تو اُس کے حق میں شفاعت یا سفارش نہیں کی جاتی۔ دوسری طرف یہ بات بھی بطور اصول غلط ہے کہ کسی نااہل کی سفارش کی جائے۔ اب درمیانی صورت یہی ہے کہ ایک نیک نیت اور عقیدہ وعمل کے اعتبار سے صالح فرد کے عمل (عقیدہ نہیں) میں معمولی کمی وکوتاہی کو اللہ تعالیٰ دور کرنا چاہے گا تو اپنے منتخب افراد (انبیاء و صدیقین، شہداء اور صالحین) کو شفاعت کی اجازت عطا فرمائے گا، یوں ہر دو طرف اپنی نوازشات کو اسی بہانے سے تقسیم کرے گا۔ اگر مطلق عمل کو جنت میں داخلہ کی بنیاد بنالیں تو عمل تو شاید کسی کا پورا نہ پڑے۔ چنانچہ عمل کی اِسی کمی کو قرآن کا نظریۂ شفاعت پورا کرتے کا ربانی عطیہ ہے، معمولی کمی بیشی کو پورا کرنے کی ایک دلچسپ مثال دنیوی طور پر خود میری زندگی میں آئی۔ میٹرک کے امتحان میں میرے 535 نمبر تھے۔ اس وقت 540 پر فسٹ ڈویژن بنتی تھی لیکن جب سند آئی تو وہ فسٹ ڈویژن کی تھی۔ یہ 5 نمبر رعایتی اس اصول کے تحت تھے کہ کمی معمولی ہے، اگر 6 نمبر بھی کم ہوتے تو شاید فسٹ ڈویژن کی سند نہ آتی اور مکمل فیل کو تو کوئی بھی پاس نہیں کرتا۔ لہٰذا نظریۂ شفاعت اہل اور نیک افراد کے لیے عطیۂ ربانی ہے۔

مطلق عمل کو نجات کا ذریعہ قرار دینے کی نفی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتا ہے ''......اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کردیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔'' (۴/ ۴۸) اس آیت مبارکہ سے بھی واضح طور پر عقیدہ کے برعکس عمل میں رعایت کا پہلو واضح طور پر موجود ہے۔

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ ❶

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنا آپ بُرا کیا، تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوں گے۔''

﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ ﴾ ❷

''اے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اِس کے کہ تُو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر بے شک تُو ہے بڑا دینے والا۔''

آخر میں مَیں ڈاکٹر رحمت الٰہی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مسودہ محنت سے پڑھا اور کمپوزنگ کی اغلاط کے علاوہ بعض ضعیف احادیث کی نشاندہی کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں خیرِ کثیر عطا کرے۔ عزیزم سجاد حسین سرمد کا بھی شکرگزار ہوں کہ کتاب ہذا کی کمپوزنگ محنت سے کی اور بار بار اضافہ و ترمیم کی مشقت سے دل تنگ نہیں کیا۔

محترم جناب فاضل نوجوان عالم دین اور محقق تنویر الاسلام فاضل علوم اسلامیہ استاد جامعہ لاہور الاسلامیہ کا بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر اس کتاب کی نظرِ ثانی کی اور اس کی نوک پلک سنوار کر نورٌ علیٰ نور کے مصداق بنا دیا۔

محمد ایوب شاہد
مدنی کالونی، اٹک کینٹ
۲/ جولائی ۲۰۱۳ء

❶ الاعراف : ۷/ ۲۳.
❷ آل عمران : ۳/ ۸.

حرفِ تمنا :

نبی اکرم ﷺ بحیثیت علمبردار توحید

اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کے لیے تمام انبیاء و رسول میزانِ عدل کے ساتھ مبعوث فرمائے۔ ان سب کی دعوت کا نقطہ آغاز توحید تھا۔ سب نے توحید کی دعوت کو پھیلانے، عام کرنے اور توحید کی ضد شرک کی تردید میں پورا حق ادا کر دیا...... شرک کے اندھیروں کو مٹایا...... یوں رفتہ رفتہ کعبہ کو پاسبان مل گئے صنم خانے سے۔

اسلام زمانے میں دبنے کو نہیں آیا   اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

لیکن صد افسوس کہ اہل شرک و کفر نے توحید اور داعیانِ توحید کی دعوت کو کچلنے، رد کنے اور توحید کے چراغ کو پھونکوں سے بجھانے کے لیے ناتمام سعی کی جو کسی طرح بھی کامیاب نہ ہوسکی اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ (ان شاء اللہ)

حقیقت یہ ہے کہ توحید پر حملہ اور اس کے نصب العین کو حرف غلط کی طرح مٹانے میں نام نہاد اسلامیان کا کردار کسی اسلام دشمن سے کم نہیں لیکن لاعلم اور دین خیف سے دور لوگ ان سے بچنے کی بجائے ان کی تقلید میں لگے ہوئے ہیں۔

یا رب عطا کر ان کو بصارت بھی بصیرت بھی   کہ مسلمان جا کر لٹتے ہیں سواد خانقاہی میں

اس کتاب میں ایسے ہی توحید مخالف فکر کی تردید کی گئی ہے۔ فلسفہ یونان سے مغلوب، فکر تصوف وحدت الوجود، وحدت الشہود اور ہمہ اوست و ہمہ از اوست اور جدید فکری یلغاروں کا قرآن و حدیث کے دلائل روشنی میں رد کیا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو نہایت علمی و تحقیقی پایا ہے۔ جہاں تک ہوسکا اس کی نوک پلک اور نصوص کی تصحیح، حوالہ جات اور اپنی معلومات کے مطابق اصلاح کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کتاب ہذا جناب ڈاکٹر شاہد ایوب و جملہ معاونین دارا کین کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کی حسنات کو قبول اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ اس کتاب کو تمام طبقہ ہائے فکر کے لیے یکساں مفید تر بنائے۔ آمین اور اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کو بحیثیت ''علمبردار توحید'' پیش کیا گیا ہے اور توحید کو شرک سے بچاؤ کے لیے جو کوشش کی گئی ہے، اسے سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو کر توحید کے پیغام کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

العبد الفقیر الی اللہ الغنی

حافظ تنویر الاسلام

مدرس جامعہ لاہور الاسلامیہ، لاہور

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

توحید، حیات وکائنات کی اصل حقیقت ہے اور یہ اس قدر اہم ہے کہ صرف اِسی حقیقت کی تفہیم واثبات کے لیے بے شمار انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے مبعوث کیا گیا، حضرات انبیا علیہم السلام نے بغیر کسی عوض و معاوضہ اور خوف وخطر، انسانوں کو اس کی طرف بلایا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسانوں نے کبھی تو اس حقیقت کو فراموش کر دیا اور کبھی اِس میں آمیزش کر دی۔ حقیقت کو بھول جانا یا فراموش کر دینا بھی ایک غلطی ہے، جسے اسلامی اصطلاح میں ''کفر'' کہا جاتا ہے لیکن یہ بات قرآن وحدیث سے واضح ہوتی ہے کہ آمیزش، اسلامی اصطلاح میں ''شرک'' کو نہایت سنگین ''جرم'' قرار دیا گیا ہے اور یہ بات بھی عام طور پر معلوم ہے کہ دنیا میں 'کفر' کے مقابلے میں 'شرک' کرنے والے ہمیشہ زیادہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بحالتِ مجبوری باطمینانِ قلب انسانی جان کے تحفظ کے لیے ''زبانی کفر'' کی تو اجازت دی ہے، مگر شرک کے بارے میں انتہائی واضح اعلان کیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝٤٨﴾ [1]

''اللہ یہ بات کبھی معاف کرنے والا نہیں کہ اُس کے ساتھ (کسی کو) شریک گردانا جائے۔ ہاں اس کے سوا جسے چاہے بخش دے اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔''

اور حدیثِ پاک میں آتا ہے:

---

[1] النساء: ٤/ ٤٨.

((عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ اَوْصَانِي خَلِيلِي اَنْ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئاً وَّاِنْ قُطِّعْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَتْرُكْ صَلٰوةً مَكْتُوبَةً مُّتَعَمِّدًا.)) ❶

سیّدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے پیارے محبوب ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو خواہ قتل کر دیے جاؤ، خواہ جلا دیے جاؤ اور فرض نماز کو جان بوجھ کر ترک نہ کرنا۔''

کائنات، ایک شاہکار تخلیق:

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے، اثباتِ ذاتِ باری تعالیٰ پر اتنا زور نہیں دیا، کیونکہ انسان ابتدا ہی سے بوجۂ تخلیق و نظمِ کائنات اس بات سے آگاہ رہا ہے کہ تخلیق، خالق کے اور نظمِ کائنات، کسی منتظم کے وجود کا تقاضا کرتا ہے، تاہم اپنی محدود ذہنی استعداد اور جسمانی صلاحیتوں کے، وہ اِس بات میں ہمیشہ گومگو میں رہا کہ صرف ایک ہستی اتنی بڑی کائنات کے نظم و قیام کے لیے کافی ہو!!!...... چنانچہ وہ اپنی نفسی ساخت کے پس منظر میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے لیے مددگار بناتا رہا اور یوں ایک طرح سے وہ اللہ تعالیٰ کی ہمدردی میں اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتا رہا اور یہ کام اتنے تسلسل سے کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ کو باقاعدہ انبیاء علیہم السلام کا ایک طویل سلسلہ بھیجنا پڑا جو انسان کو برابر یہ سمجھاتے رہے کہ یہ کارخانۂ قدرت، صرف ایک ہستی کی تخلیق ہے اور وہ ایک ہی ہستی اتنی قوت وطاقت کی مالک ہے کہ وہ تن تنہا اس کے قیام و ثبات اور نظم و نسق پر قادر ہے، لہٰذا اللہ کے لیے مددگار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ڈیوٹی:

توحید وہ بنیادی پیغام ہے جس پر سیّدنا آدم علیہ السلام سے محمد ﷺ تک تمام انبیاء نے یکساں زور صَرف کیا اور اگر یہ کہا جائے کہ تمام انبیاء صرف اسی ایک حقیقت کے پیامبر تھے، تو غلط نہیں ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

❶ ابن ماجه، كتاب الفتن، رقم: ٤٠٣٤.

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ ❶

''اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا، جس کو ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں، پس عبادت میری ہی کرو۔''

یہ تو قرآن حکیم کا ایک اجمالی یا عمومی بیان ہے کہ تمام انبیاء نے صرف ''دعوتِ توحید'' دی، مگر آپ تفصیل میں جائیں تو دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے فرداً فرداً انبیاء کا نام لے کر بھی وضاحت کر دی کہ ہر قوم کی طرف جو پیغمبر آیا، اُس نے یہی دعوت دی:

﴿ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ ﴾ ❷

''اور ہم نے عاد کی طرف اُس کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (شرک کر کے) تم تو صرف بہتان باندھ رہے ہو۔''

﴿ وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ ﴾ ❸

''اور قومِ ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھیجا، اُس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اسی نے اس زمین میں تمہیں بسایا۔ پس تم اس سے معافی طلب کرو اور اُس کی طرف رجوع کرو بے شک میرا رب قریب ہے اور دعاؤں کا سننے والا ہے۔''

---

❶ الانبياء: ٢١/ ٢٥. ❷ هود: ١١/ ٥٠.
❸ هود: ١١/ ٦١.

﴿ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝۸۴ ﴾ ❶

''اور ہم نے مدین والوں کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں تمھیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھیرنے والے عذاب کا خوف ہے۔''

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ میں آپ نے محسوس کرلیا ہوگا کہ قرآنِ حکیم بار بار''الٰہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے، یعنی تمام انبیاء نے 'الٰہ واحد' کی دعوت دی، خود نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا'' لا الہ الا اللہ کہو فلاح پا جاؤ گے، یہ چند حروف پر مشتمل ایک کلمہ ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہی لوگ جو آپ ﷺ کو صادق وامین وکریم کہتے تھے، مکہ کا شریف ترین نوجوان خیال کرتے تھے، عزت واحترام کرتے تھے، وہی شدید ترین دشمن بن گئے اور تو اور آپ کا سگا چچا ابولہب آپ کو مارنے پر تُل گیا اور دوسرے مشرکین کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا۔ اِس چھوٹے سے کلمہ لا الہ الا اللہ کے نتیجہ میں قریشِ مکہ کے رویہ میں حیرت انگیز تبدیلی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس کی معنویت پر کس قدر قدرت رکھتے تھے اور اتنے باشعور تھے کہ انھوں نے اپنی لسانی مہارت کی بنیاد پر وہ سب کچھ پہلے دن ہی محسوس کرلیا جو بعد میں قرآن حکیم میں بتدریج سامنے آیا۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ قریشِ مکہ محمد ﷺ سے تو بحیثیت محمد بن عبداللہ محبت کرتے تھے، اُن کا احترام کرتے تھے، تنازعات میں بطور منصف قبول کرتے تھے، آپ پر حد درجہ اعتماد کرتے کہ امانتیں آپ کے پاس جمع کرواتے اور صداقت کی مثال کے طور پر''صادق'' کہتے تھے۔ مگر ''الٰہ واحد'' کی دعوت پر دشمنی پر اُتر آئے اور محمد ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق اور

❶ هود: ١١/ ٨٤.

رویے کو یکسر بدل دیا، گویا قریشِ مکہ کی اصل دشمنی ''الٰہ واحد'' سے تھی اور یہی حقیقت ہے۔

یہ حقیقت صرف محمد ﷺ سے ہی خاص نہیں بلکہ تمام اقوام نے اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام سے دشمنی صرف اور صرف اِسی وحدتِ الٰہ یا توحید کی وجہ سے کی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی ایک لفظ ''الٰہ'' میں وہ کون سی بجلی پوشیدہ ہے کہ جس کا کرنٹ اقوام کے لیے نا قابلِ برداشت تھا؟ اور ''الٰہ واحد'' کے دعوے داروں کو انھوں نے نہ صرف اذیتیں اور تکلیفیں دیں بلکہ انھیں قتل کر دیا اور خود نبی پاک ﷺ کے لیے کئی بار ایسی کوششیں کی کہ آپ کا وجود ختم کر دیا جائے، وہ یہ تو نہ کر سکے مگر آپ کو مسلسل اذیتیں دیتے رہے یہاں تک کہ آپ کو اپنا وطنِ عزیز مکہ چھوڑنا پڑا اس حال میں کہ آپ ﷺ رو رہے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ یہ بھی فرمایا: ''میں اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ ستایا گیا ہوں۔ مگر عزم واستقامت کے پیکر بھی ایسے تھے کہ تمام دینوی سہارے ختم ہونے پر بھی فرمایا کہ، اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں (یعنی دنیا کی ساری دولت واقتدار مجھے دے دیں) تب بھی میں اِس حقیقت (توحید) کے بیان سے باز نہیں آؤں گا۔''

''الٰہ'' کی قرآنی معنویت:

آیئے! قرآن حکیم کے مطالعے سے ہم یہ معلوم کریں کہ لفظ ''الٰہ'' میں ایسی کیا خصوصیت یا خصوصیات ہیں جس کے نتیجہ میں دوستی، دشمنی میں اور پیار، نفرت میں بدل جاتا ہے؟ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر ''الٰہ'' کو جس سیاق وسباق میں استعمال کیا گیا اور اس سے معنی میں جس قدر وسعت پیدا ہوگئی ہے، اُسے دیکھ کر قریشِ مکہ کی لسانی مہارت کی داد دینی پڑتی اور اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اگر اپنی زبان دانی پر فخر کرتے تھے اور غیر عرب کو عجمی (گونگا) کہتے تھے تو بے جا نہ تھا۔ چنانچہ اگر انھوں نے محمد ﷺ کے ''الٰہ'' کے دعوٰی کی مخالفت کی اور دشمنی پر اُتر آئے تو وہ اپنے اعتقاد وعقیدہ کے حوالے سے درست تھے، کہ یہ ایک لفظ اُن کے پورے نظامِ عقائد وعبادات اور معاملات کے لیے بلاشبہ ''ایٹمی دھماکہ'' تھا۔

آیت الکرسی:

سب سے پہلے تو آیئے کہ مشہور ومعروف آیت، جو اکثر تمام مسلمانوں کو یاد ہوتی ہے ،میں لفظ ''الٰہ'' کی معنویت پر غور کریں، بلاشبہ اگر اس ایک آیت، آیت الکرسی کے معانی ومفہوم کو سمجھ لیا جائے اور اللہ توفیق بھی دے تو انسان شرک جیسے قبیح اور نا قابلِ معافی گناہ سے بچ سکتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝ ﴾ [1]

'' اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ اور سب کا تھامنے والا ، جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، زمین وآسمان کی تمام چیزیں اُس کی ملکیت ہیں۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے آگے شفاعت کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی کی وسعت نے زمین وآسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت سے تھکتا ہے نہ اُکتاتا ہے۔ وہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔''

مندرجہ بالا آیت کی معنویت پہ آپ غور فرمائیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح قرآنِ حکیم نے، ایک دعویٰ کیا کہ اللہ ہی اکیلا ''الٰہ'' ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا ''الٰہ'' نہیں اور پھر نہایت منطقی انداز میں دلائل کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے اور دلائل بھی اتنے واضح اور قوی کہ معمولی سمجھ بوجھ والا انسان بھی ''الٰہ'' اور ''غیر الٰہ'' کے فرق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

[1] البقرۃ: ۲/ ۲۵۵۔

آیئے...... ذرا تفصیل سے ان دلائلِ قرآنی پر گفتگو کریں۔

پہلی دلیل:...... کہ اللہ اکیلا الہ ہے کوئی دوسرا الہ نہیں، کیوں......؟ اس لیے کہ وہ "اَلْحَيُّ" ہے۔ "ال" کے ساتھ تخصیص کردی کہ وہ صرف 'حَیّ' نہیں ہے بلکہ "الحي" ہے۔ ہم سب مانتے ہیں کہ حي یعنی زندہ تو تمام انسان وحیوانات بلکہ پودے بھی زندہ وجود ہیں لیکن "الحي" کے سوا جتنے بھی "حي" ہیں، وہ ایک زمانی مدت رکھتے ہیں اور ایک دن وہ اس "حي" کی حیثیت سے دست بردار ہوکر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں، اب دیکھیے دعویٰ یہ ہے کہ میں ''الہ'' ہوں، دلیل یہ ہے کہ میں "اَلْحَيُّ" ہوں۔ اب اگر کوئی دوسرا ''دعویٰ دار الوہیت'' ہے تو دلیل لائے، ظاہر ہے کہ کائناتِ ارضی وسماوی میں کوئی دوسرا یہ دعویٰ نہیں کرسکتا اور اگر نہیں کرسکتا تو پھر ''الہ'' نہیں۔

دوسری دلیل:...... کہ میں ''الہ واحد'' ہوں کیوں کہ میں "القیوم" ہوں، یہاں بھی ''ال'' سے تخصیص قائم کردی کہ انسان اور حیوانات بلکہ پودے بھی اپنے وجود کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ لیکن اپنے قیام میں ہمیشگی کا دعویٰ دار کوئی ہے؟ ہرگز نہیں اور اگر کوئی ہمیشہ قائم نہیں تو پھر وہ ''الہ'' نہیں ہوسکتا کیونکہ جو خود قائم نہ رہ سکے، تو وہ دوسروں کو کیسے قائم رکھ سکتا ہے؟

بقول میر تقی میر ؎

کس طرح آہ! خاکِ مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر مجھ سے جو مرا دستگیر ہو

دست گیر، ہاتھ تھامنے والا (مددگار) اگر خود ہی گرا ہوا ہو، تو مجھ کو کیسے اٹھائے گا؟

یہاں بھی دعوے کو دلیل اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ ''الہ'' وہی ہوگا جو ہمیشہ قائم ودائم ہو جسے اندیشۂ فنا وزوال نہ ہو۔

تیسری دلیل: ...... دعویٰ وہی ہے کہ میں الہ ہوں، کیوں الہ ہوں......؟ کہ مجھے ''اونگھ'' نہیں آتی، کتنی عام فہم اور انتہائی منطقی دلیل ہے کہ ''اونگھ'' کا آنا الہ ہونے کے منافی

ہے، کیوں منافی ہے......؟ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ ''الہ'' کے ساتھ ''پکارنے'' کا تلازمہ انتہائی سختی سے جُڑا ہوا ہے، بلکہ ''الہ'' اور ''غیب میں پکارنا'' لازم وملزوم ہیں، چنانچہ ایک فرد 'الہ' کو اپنی حاجات اور مشکلات میں پکار رہا ہو اور وہ زندہ اور قائم (موجود) بھی ہو، مگر اونگھتے ہوئے تو سن ہی نہیں سکے گا۔ دوسرا اونگھنا کمزوری کی علامت ہے کہ جو اپنے وجود پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا، ڈانواں ڈول ہو رہا ہے، وہ دوسرے کی مدد کیسے کرے گا؟ چنانچہ میں الہ ہوں کہ مجھ پر ''اونگھ'' جیسی کمزوری طاری نہیں ہوتی۔

چوتھی دلیل: ...... دعویٰ وہی کہ میں ''الہ'' ہوں۔ کیوں جی آپ ہی الہ کیوں ہیں......؟ اس لیے کہ مجھے ''نیند'' نہیں آتی۔ 'نیند' نہ آنا الہ ہونے کی دلیل کیوں......؟ اس لیے کہ جس الہ کو آپ غیب میں مشکلات و حاجات میں مدد کے لیے پکار رہے ہیں، وہ تو سویا ہوا ہے، سونا اور مرنا مماثل ہیں۔ چنانچہ سویا ہوا انسان (جی ہاں انسان کیوں کہ بت نہ سوتے ہیں نہ اونگھتے ہیں، اور ''الحيّ والقيوم'' تو ہوتے ہی نہیں) اپنے وجود و خیالات پہ بھی قدرت کھو چکا ہے وہ ایسا ہی بے بس اور کمزور پڑا ہے جس طرح ایک مردہ انسان ہوتا ہے کہ اپنے منہ سے مکھی تک نہیں اُڑا سکتا۔ چنانچہ نیند، دعویٰ الوھیت کی یکسر نفی کر دیتی ہے جو ''الہ'' ہوگا وہ سوئے گا نہیں اور جو سوئے گا وہ ''الہ'' نہیں ہوگا۔

'الوہیت الہ واحد' پر مندرجہ بالا چار دلائل، ذات باری تعالیٰ سے متعلق ہیں جنھیں آپ اصطلاحاً 'انفسی' کہہ سکتے ہیں۔ اب آیت الکرسی میں ہی آفاقی دلائل دیکھیے۔

پانچویں دلیل: ...... دعویٰ وہی کہ میں ''الہ'' ہوں میرے سوا کوئی الہ نہیں، کیوں جی......؟ اس لیے کہ ''زمین و آسمان کی تمام اشیاء میری ملکیت ہیں'' آپ غور فرمائیے کہ دعویٰ الوہیت پر کتنی زبردست اور منطقی دلیل قائم کی گئی کہ ''الہ'' وہی ہوگا جس کی ملکیت آسمان و زمین میں جاری وساری ہو اور کوئی دوسرا اس ملکیت کا دعوے دار نہ ہو۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ اگر کوئی اور بھی دعوے دار الوہیت ہے تو وہ دلیل لائے اور ثابت کرے کہ زمین و آسمان میں تمام اشیا اس کی ملکیت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی اور اس طرح کا

دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اس قسم کے دعوے کو تسلیم کرے گا۔ کیونکہ مخلوق (انسان، جن) کو وسائل و اسباب کے اندر جو کچھ دیا گیا ہے، اُس پر ''حد مکانی'' اور ''حد زمانی'' ہر دو کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں ملکیت محدود اور عارضی ہے اور یہ بھی نظامِ کائنات کے اصول کے تحت کہ انسان اسباب ووسائل کے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ گویا محدود اور عارضی ملکیت بھی انسان کی محتاجی کی علامت ہے۔ یہ ملکیت مرنے کے ساتھ تو ختم ہوجاتی ہے، زندگی میں اس سے چھن سکتی ہے، لہٰذا کسی بھی باشعور انسان کا یہ شیوہ نہیں رہا کہ وہ اس عطا کردہ محدود اور عارضی ملکیت پر، یہ دعویٰ الوھیت کرے البتہ نمرود اور فرعون جیسے بدبخت انسان ایسے دعوے کرتے اور انجام کو پہنچتے رہے۔

چھٹی دلیل: ...... دعویٰ وہی کہ میں الٰہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیوں جی اور کیوں نہیں؟ اس لیے کہ میری اجازت کے بغیر شفاعت تک نہیں ہوسکتی؟ یعنی کسی کو معاف کردینے یا مجرم و گنہگار کو چھوڑ دینے کا اختیار تو کسی کے ہاتھ میں سرے سے ہی نہیں، کیونکہ کسی کے پاس نہ قوت ہے نہ طاقت، ساری کی ساری قوت وطاقت میرے لیے ہے (لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) لیکن کسی کے لیے سفارش کرنے کا اختیار بھی اس وقت تک نہیں جب تک میں اجازت نہ دوں اور پھر یہ بھی کہ میں اس بات کو پسند بھی کروں۔ چنانچہ دو باتیں معلوم ہوئیں کہ سفارش یا شفاعت کرنے والا، الٰہ نہیں ہوسکتا اور شفاعت کرنا، اپنے اندر طاقت وقوت کی نفی کو تسلیم کرنا ہے، بغیر قوت و طاقت کے کوئی الٰہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا میں اکیلا ہی الٰہ ہوں۔ (یہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ مشرکین بھی اپنے بتوں کو سفارشی خیال کرتے تھے)۔

ساتویں دلیل: ...... دعویٰ وہی کہ میں الٰہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، اچھا جی کیوں......؟ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ جو اُن کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور میرے علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا مگر جتنا میں خود بتادوں۔

یہاں واضح طور پر کلی علمِ غیب کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ''الٰہ'' کی ایک صفت بتائی گئی

ہے اور جزوی علم بھی جو دوسروں (رسولوں) کو عطا کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کارِ نبوت کے لیے عطا کرتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، بتاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بذریعہ وحی، جن فرشتوں، آخرت اور اس میں حساب و کتاب کا ہونا، جنت اور دوزخ کا وجود وغیرہ ساری کی ساری معلومات رسولوں کے ذریعہ دی گئیں، اسی طرح گزشتہ اقوام کے حالات وواقعات کے متعلق بھی ضرورت کے تحت انبیا علیہم السلام کو آگہی بخشی گئی اور یہ آگہی خود دلیلِ نبوت بھی قرار پائی کہ انبیاء جو اُس وقت موجود نہ تھے اور نہ کوئی مادی سبب (اس زمانے کے افراد یا تاریخی کتب وغیرہ) موجود تھا مگر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ معلومات کی بنا پر مخالفین کے منہ بند کر دیے۔ یاد رہے کہ عطائی علم کی بنیاد پر کسی کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا ورنہ پھر تمام یہودی، عیسائی اور مسلمان عالم الغیب کہلائیں گے کیونکہ تمام اپنے انبیاء کی وساطت سے غیب پر مطلع ہیں، جیسے انبیاء اللہ کی وساطت سے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کلی اور جزئی ہر دو طرح کا علم غیب صرف اللہ کے لیے ہے کیونکہ خود سے کوئی بھی فرد ادنیٰ سے غیب پر مطلع نہیں ہوسکتا اور جب غیب پر مطلع کر دیا جائے تو وہ غیب نہیں رہتا، نیز الوھیت لازم آتی ہے اور اسی کی نفی کی جارہی ہے کہ میں ''الٰہ'' ہوں کیونکہ میں ''عالم الغیب'' ہوں اور آخری بات فرمائی کہ ان کی حفاظت ونگہبانی میرے لیے دشوار ہے نہ تھکا دینے والی۔ شرک کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ اتنی وسیع وعریض کائنات کا نظم ونسق جو احاطۂ خیال سے بھی ماورا ہے، ایک ہستی کیسے چلا سکتی ہے؟ لازماً اس کے لیے دوسرے مددگار ومعاون ہوں گے یہاں شرک کی تردید کی گئی کہ میرے لیے جس طرح تخلیق میں دشواری نہ تھی ایسے ہی انتظام میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ آیت الکرسی کو حدیث میں بھی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا کہ ''الٰہ واحد'' کا بھرپور نقشہ انسان کے ذہن پر مرتب کرتی ہے۔

مفسر کنز الایمان کی تفسیر:

سید محمد نعیم الدین مراد آبادی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں الٰہیات کے اعلیٰ مسائل کا بیان ہے اور اس سے ثابت ہوتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ الٰہیت میں واحد ہے، حیات کے ساتھ متصف ہے۔ واجب الوجود ہے۔ اپنے سے ماسوا کا موجد ہے۔ تحیر و حلول سے منزہ اور تغیر و فتور سے مبرا ہے، نہ کسی کو اس سے مشابہت نہ عوارضِ مخلوق کو اس تک رسائی، ملک و ملکیت کا مالک ، اصول و فروع کا مبدع، قوی گرفت والا، جس کے حضور سوائے ماذون کے کوئی شفاعت کے لیے لب نہ ہلا سکے۔ تمام اشیاء کا جاننے والا، جلی کا بھی اور خفی کا بھی، کلی کا بھی اور جزئی کا بھی، واسع الملک والقدرۃ، ادراک و وہم وفہم سے برتر و بالا۔'' [1]

الٰہ کے متعلق عالمگیر دلائل:

''الٰہ'' کی قرآنی معنویت اور وسعت جاننے کے لیے قرآن حکیم کا ایک اور مقام دیکھیے کہ کس طرح قرآن حکیم نہایت جامع، مدلل اور پُر اثر انداز میں آفاقی دلائل فراہم کر کے ''الٰہ واحد'' کی معنویت کا تعین کرتا ہے اور انھیں دلائل کی بنیاد پر چیلنج کرتا ہے کہ اگر کوئی دوسرا ''الٰہ'' بھی ہے تو مقابل لاؤ! ملاحظہ فرمایے:

﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا

[1] کنزالایمان فی ترجمہ القرآن ، ص۷۷.

بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ ﴾ [1]

''بھلا بتاؤ تو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کس نے آسمان سے بارش برسائی؟ پھر اس سے ہرے بھرے بارونق باغات اُگا دیے۔ ان باغوں کے درختوں کو تم ہرگز نہیں اُگا سکتے تھے۔ (تو) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ لوگ سیدھی راہ سے ہٹ جاتے ہیں اور وہ جس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں جاری کردیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کردیا (تو) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر نا سمجھ ہیں۔ کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب کہ وہ اُسے پکارے اور کون اُس کی تکلیف کو دور کردیتا ہے؟ اور (کون) تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (جو یہ کام کرتا ہو) تم لوگ کم ہی غور وفکر کرتے ہو۔ اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تمھیں راستہ دکھاتا ہے اور اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری دے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (جو ان کاموں میں شریک ہو)؟ کہہ دیجیے کہ سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ کہہ دیجیے کہ آسمانوں والوں میں سے اور زمین والوں میں سے کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے؟''

حاصلِ گفتگو:

مندرجہ بالا آیات میں نہایت منطقی لیکن انتہائی سادہ انداز میں ایک ہی سوال اٹھایا گیا ہے اور جواب بھی دلیل سے مانگا گیا ہے کہ:

① زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا۔

[1] النمل: ۲۷/ ۶۰تا۶۵۔

(۲) آسمان سے بارش برسانے والا۔

(۳) ہرے بھرے باغات اور درختوں کو اُگانے والا۔

(۴) زمین کو جائے قرار (ٹھہرنے کی جگہ) بنانے والا۔

(۵) زمین میں نہریں جاری کرنے والا۔

(۶) پہاڑ بنانے والا۔

(۷) دو سمندروں کے درمیان آڑ (پردہ) بنانے والا۔

(۸) بے قرار کی پکار سننے والا اور اس کی پریشانی دور کرنے والا۔

(۹) زمین میں انسان کو خلیفہ بنانے والا۔

(۱۰) خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھانے والا۔

(۱۱) رحمت (بارش) سے قبل خوش خبری دینے والی ہوائیں چلانے والا۔

(۱۲) مخلوق کو اول پیدا کرنے والا۔

(۱۳) دوبارہ (بروزِ قیامت) اٹھانے والا۔

(۱۴) آسمان اور زمین سے روزی دینے والا۔

(۱۵) آسمانوں والوں اور زمین والوں میں علمِ غیب رکھنے والا۔

اگر یہ سارے کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے تو اُسے ہم اللہ تعالیٰ کا ساتھی (شریک) مان لیتے ہیں۔ یہاں خاص طور پر ”ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ“ کہا گیا یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اس لیے کہ مشرکین اللہ کی الوہیت کے انکاری نہ تھے بلکہ اس میں دوسروں کو شریک گردانتے تھے، لیکن اس سوالیہ انداز میں تمام مشرکین کو بے بس کردیا گیا کہ اگر خدائی کام میں کوئی شرکت کا دعوے دار ہو تو پھر بتاؤ وہ یہ کام کرسکتا ہے؟ اور اگر نہیں کرسکتا تو پھر شرک سے باز آجاؤ اور آخر میں ایک خاص بات کی طرف اشارہ کرکے اس بات کی بھی نفی کردی گئی کہ محض پتھر کے بت اللہ کے شریک ہیں بلکہ پتھر کے بت تو محض نمائندہ یا پیکرِ محسوس ہیں، اصل تو اُن کے پسِ پشت تمھارے بزرگ اور بڑے ہیں، جن کے تم نے بت بنا لیے، مگر تمھارے

بڑوں کو یہ بھی نہیں پتا کہ قیامت کب قائم ہوگی اور وہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے......؟
یہ دوبارہ اٹھائے جانے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ جنھیں اللہ کے ساتھ شریک بنایا جاتا ہے وہ انسان ہیں، کیونکہ بتوں کی بعث ثانی یعنی دوبارہ زندہ کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں کیونکہ بت بے جان، بے اختیار، قول وعمل سے عاری، لہٰذا جب اختیار نہیں توامتحان نہیں، امتحان نہیں تو فیل پاس (جزاوسزا) نہیں اور دوبارہ اٹھایا جانا نہیں۔ یہ نہایت کم علمی اور ناسمجھی ہے کہ شرک کو خواہ وہ ماضی کا ہو یا حال کا، اُسے محض بتوں تک محدود کردیا جائے، کوئی نادان سے نادان انسان بھی یہ باور نہیں کرسکتا ہے۔ آج بھی بت پرستی کو دیکھیں تو ہندوؤں کے بت اُن کے دیوی دیوتاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بدھ مت کے بت گوتم بدھ کے نمائندہ ہیں یا بڑی شخصیات کے موم کے مجسمے، نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ قرآن حکیم واضح انداز میں الوھیت میں انسانوں، جنوں اور فرشتوں وغیرہ کے شریک کیے جانے کی وضاحت کرکے، نفی کرتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں: فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝١٩١ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ۝١٩٢ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ۝١٩٣ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۖ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝١٩٤ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ۝١٩٥ ﴾ ❶

''کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہو جو کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں! جو نہ اُن کی مدد کرسکتے ہیں نہ اپنی مدد پر قادر ہیں، اگر تم کوئی بات بتلانے کو پکارو تو وہ تمھارے کہنے پر نہ چلیں، تم انھیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتیں یکساں ہیں، تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ تم ہی

❶ الاعراف: ۷/ ۱۹۱تا۱۹۵.

جیسے بندے ہیں، سو تم انھیں پکارو پھر چاہیے کہ وہ تمھارا کہنا پورا کر دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں، کیا ہاتھ رکھتے ہیں کہ اُن سے پکڑیں؟ یا آنکھیں رکھتے ہیں کہ اُن سے دیکھیں یا کان ہیں جن سے سنتے ہوں؟ آپ کہہ دیجیے! تم اپنے شریکوں کو بلالو، پھر سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

غور طلب مسئلہ:

آخری آیت سے بعض مفسرین نے اُن آیات کو بھی بتوں پر محمول کیا ہے کہ وہ چلنے پھرنے، پکڑنے، دیکھنے اور سننے سے عاری ہوتے ہیں، لیکن آیت بالا تو اُن سے اعضا کی بھی نفی کر رہی ہے۔ جب کہ بتوں کے اعضا بلکہ مکمل جسم ہوتا ہے، نیز ابتدائی آیت میں "خلق" کا لفظ استعمال ہوا اور خلق تخلیق یا پیدا کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے، بت پیدا نہیں ہوتے، پھر سب سے بڑھ کر "عباد امثالکم" تمھاری طرح کے بندے کہا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ بتوں کو انسانوں، ایسا بندہ نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ بندوں یا انسانوں ہی سے متعلق آیات ہیں۔ البتہ پکار کو نہ سنا، مدد نہ کر سکنا اور اعضا جسمانی او صفات کی نفی دلالت کرتی ہے کہ مردہ انسان مراد ہیں اور یہی تفسیر بہتر ہے اور ''احسن البیان'' میں یہی تحریر ہے کہ:

''یعنی اب اُن میں سے کوئی چیز بھی اُن کے پاس موجود نہیں، مرنے کے ساتھ ہی دیکھنے، سننے، سمجھنے اور چلنے کی طاقت ختم ہوگئی، اب اُن کی طرف منسوب یا تو پتھر یا لکڑی کی خود تراشیدہ مورتیاں ہیں یا گنبد، قبے اور آستانے ہیں جو اُن کی قبروں پر بنالیے گئے ہیں اور یوں استخوان فروشی کا کاروبار فروغ پذیر ہے۔

ع اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات'' [1]

---

[1] احسن البیان، ص٤٤٣.

اولیاء وانبیاء کو رب اور الہ بنانے کی ایک اور مثال:

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾ ❶

''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنا لیا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی، حالانکہ انھیں صرف ایک اکیلے اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی الہ (معبود) نہیں، پاک ہے وہ اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔''

یوں تو قرآن حکیم میں بے شمار ایسی آیات موجود ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ مشرک افراد واقوام، فرشتوں، جنوں، انسانوں بلکہ عورتوں کی عبادت کرتے تھے اور انھیں اپنی حاجات اور مشکلات میں پکارتے تھے، تاہم یہاں ہم صرف ایک مثال اور پیش کرتے ہیں۔ جس میں تمام معبودانِ باطلہ کو جمع کر لیا گیا ہے اور اُن کی بے بسی اور بے طاقتی پر ایک عام فہم مگر انتہائی عقلی استدلال قائم کیا گیا ہے اور انسانوں کو دعوتِ غور وفکر دی گئی ہے اور خطاب بھی تمام انسانوں سے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ﴾ ❷

''لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے ذرا کان لگا کر سنو! اللہ کے سوا جن جن کو تم پکارتے ہو وہ سب اکٹھے ہو کر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اُسے چھڑا نہیں سکتے، مدد مانگنے

---

❶ التوبة: ۹/ ۳۱. ❷ الحج: ۲۲/ ۷۳.

والا اور مدد کرنے والا، دونوں کمزور، ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی، جیسا کہ اُس کے پہنچاننے کا حق تھا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی زور و قوت والا اور زبردست ہے۔''

خالق کی قوتِ تخلیق اور مخلوق کی بے بسی:

غور کیجیے اور غور وفکر کی دعوت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ اللہ کے سوا جن کو بھی مشکلات اور حاجات میں مافوق الاسباب طریقے سے یعنی غیب میں پکارا جاتا ہے، انبیاء ہوں، اولیاء ہوں، طاقت وغلبہ رکھنے والے انسان یا بادشاہ ہوں، جن، فرشتے یا دیوی دیوتا، غرض کوئی بھی ہو، اگر وہ سب جمع ہوجائیں تو صرف اور صرف ایک مکھی پیدا نہیں کرسکتے اور اگر وہ زندہ ہیں اور کوئی کھانا وغیرہ کھا رہے ہیں تو مکھی کھانے پر بیٹھ کر کوئی ریزہ اُڑا لے جائے تو سب مل کر مکھی سے چھین نہیں سکتے۔ اب ایسے معبودانِ باطلہ جو اس قدر کمزور اور بے بس ہیں، اُن سے مدد مانگنے والا کتنا نادان اور بے وقوف ہے؟ اور اس کی نادانی اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، شان وعظمت اور قوت وطاقت کا تصور کرتا ہے، وہ جس نے زمین وآسمان کے اندر تمام افراد واشیاء کو پیدا کیا، انسان خود اپنی تخلیق میں ایسا بے مثال اور یکتا ہے کہ مخلوق میں بے نظیر ہے اور اسباب و وسائل میں اس کو جو طاقت وقوت عطا کی گئی ہے، اُس کا بھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، زمین پر اُس کی تخلیقات کی رنگارنگی ایک حیرت کدہ ہے اور آسمانوں کی وسعتوں کا تو اندازہ نہیں کہ ابھی چند دن قبل ناسا نے جو سٹلایٹ مریخ پہ بھیجی ہے وہ 22 ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتی ہوئی 8 ماہ میں مریخ کی سطح پر اُتری اور یہ فاصلہ تو معمولی خیال کیا جاتا ہے بعض ستارے اربوں نوری سال کے فاصلے پہ ہیں۔ اِس سلسلہ میں آخری آیت ملاحظہ کیجیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ [1]

---

[1] النحل: ١٦/ ٢٠۔٢١۔

''اور جن جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردہ ہیں، زندہ نہیں۔انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا؟''

قبر والوں کی حالتِ زار:

مندرجہ بالا آیت نہایت واضح انداز میں اُن افراد کا تذکرہ کر رہی ہے جو قبروں میں دفن ہیں اور صرف یہی نہیں کہا گیا کہ وہ مردہ نہیں بلکہ صراحت کی گئی اور شک کی نفی کر دی گئی۔ یہ کہہ کر کہ ''زندہ نہیں'' اور پھر قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت سے بھی آگاہ نہیں ۔یہاں ظاہر ہے کہ اُن برگزیدہ بندوں کا ذکر ہے جو اصحابِ قبور ہیں اور جنھیں پکارا جاتا ہے، کیونکہ پتھر کے بتوں کے لیے بعث بعدالموت نہیں، نہ زندگی موت کا تعلق ہے، لہٰذا یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ فوت شدہ افراد کو پکارنا منع ہے، وہ کسی کی مدد کرنے پر ہرگز قادر نہیں بلکہ پکار کا شعور تک نہیں رکھتے اور قیامت کے دن پکارنے والوں کے دعوے کی تردید کر دیں گے، اُن کے بارے میں صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ اُن کی غلطیوں کوتاہیوں سے درگزر کرے اور اُن کے درجات بلند کرے۔ یہ ایک محفوظ طرزِ عمل ہے۔ جس سے بزرگوں سے محبت بھی ہوجاتی ہے اور اُن کے لیے دعا کرے، ہم بھی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کے امیدوار ہوسکتے ہیں۔

کیا اللہ کافی نہیں؟

غیراللہ کو پکارنے میں دراصل اللہ تعالیٰ کی توہین ہے ،جب بھی کوئی اللہ کے سوا دوسروں کو غیب میں اپنی حاجات اور مشکلات کے لیے پکارتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نا اُمید ہوچکا ہے کہ وہ اُس کی مشکلات دور نہیں کرے گا یا پھر یہ کہ اللہ اُس کے لیے کافی نہیں اور اُسے مزید کی حاجت ہے، ہر دو صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی توہین لازم آتی ہے اور قرآن پاک بار بار لوگوں کو اس غیبی پکار سے منع کرتا ہے اور ساتھ

ساتھ یہ درس بھی دیتا ہے کہ اللہ ناکافی نہیں، اس لیے اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اُس کے بندے ہو تو پھر اُسی کو پکارو اور صرف اُسی پر بھروسہ کرو اور یہ جان لو کہ ہر کام کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے، اگر دنیا میں سب سے بڑے پیرو بزرگ، تمھارے ماں باپ، تمھارے لیے دعا کر رہے ہیں اور اُن کی دعا کے اثرات، حسب منشا ظاہر نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لو کہ ابھی اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا نہیں اور ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تمھارا کام ہو جائے۔ چنانچہ صبر سے اور نماز سے مدد لو اور انتظار کرو، تمھارا اللہ کے در پر ہونا ہی اتنا بڑا اعزاز ہے کہ جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کے لیے بھی یہی پسند کرتا ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿١٧٣﴾ ﴾ ❶

”اور جب اُن سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمھارے خلاف لشکر جمع کیے ہیں، تم اُن سے ڈرو، تو یہ سن کر اُن کا ایمان اور بڑھ گیا اور کہنے لگے ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔“

مزید ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾ ﴾ ❷

”آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود (الٰہ) نہیں۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ

---

❶ آل عمران: ۳/ ۱۷۳.

❷ التوبه: ۹/ ۱۲۹.

اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ ﴿٣٦﴾ ❶

''کیا اللہ اپنے بندے (محمد ﷺ) کے لیے کافی نہیں؟ یہ لوگ آپ کو اللہ کے سوا اوروں سے ڈرا رہے ہیں اور جسے اللہ گمراہ کردے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جسے اللہ ہدایت دے تو اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں؟''

مندرجہ بالا آیات انتہائی وضاحت وصراحت سے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو کافی سمجھنے، اُسی پر بھروسہ کرنے پر دلالت کناں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو ''الٰہ'' سمجھنے سے منع کرتی ہیں اور اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ دوسروں کو غیب میں پکارنے والا اللہ کو ناکافی سمجھتا ہے۔

چنانچہ عافیت کا پہلو اسی میں ہے کہ غیب میں مدد کے لیے صرف اللہ کو پکارا جائے اور اپنی ساری امیدیں صرف اس ایک سے وابستہ کی جائیں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اللہ کے سوا، جن کو پکارا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ کبھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کبھی انھوں نے کہا ہے کہ ہمیں پکارو کہ ہم تمھاری مدد کو آئیں گے، اس کے بالکل برعکس اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿٥٥﴾ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا وَ ادْعُوْہُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿٥٦﴾﴾ ❷

''پکارو اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں اصلاح ہوجانے کے بعد فساد نہ کرو اور اللہ ہی کو

---

❶ الزمر: ۳۹/ ۳۶.

❷ الاعراف: ۷/ ۵۵-۵۶.

پکارو خوف اور طمع ❶ کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک لوگوں سے قریب ہے۔"

﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ❷

"پکارتے رہو اپنے اللہ کو دین کو خالص کر کے گو کافر بُرا ہی مانیں۔"

ارشادِ ربانی ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا﴾ ❸

"کہہ دیں کہ میں تو اپنے رب کو ہی پکارتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

﴿وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ ❹

"تمھارا رب کہتا ہے، مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

توحید کے عقلی دلائل:

آخری آیت کی تفسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں:

"یعنی دعائیں قبول کرنے اور نہ کرنے کے جملہ اختیارات میرے پاس ہیں، لہٰذا تم دوسروں سے دعائیں نہ مانگو بلکہ مجھ سے مانگو۔ اس آیت کی روح کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے:

❶ معلوم ہوا کہ جہنم کا خوف اور اُس سے بچنے اور جنت کی لالچ اور اُس کے حصول کی دعا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے بلکہ حکم ہے لہٰذا اس کے برعکس لوگوں کا خیال درست نہیں کہ عبادتِ الٰہی میں کوئی غرض نہ ہو، انسان کو بے نیازی زیب نہیں دیتی۔ اللہ کا انسان اُس کا سوال کرنا اور صرف اُس سے سوال کرنا پسند ہے۔

❷ المومن: ٤٠/ ١٤.　❸ الجن: ٧٢/ ٢٠.

❹ المومن: ٤٠/ ٦٠.

❶ ...... اوّل یہ کہ دعا آدمی صرف اُس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع وبصیر اور فوق الفطری اقتدار (Suprnatural Power) کا مالک سمجھتا ہے، اور دعا مانگنے کا محرک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالمِ اسباب کے تحت فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہورہے ہیں، اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے، ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔ خلوت کی تنہائیوں میں پکارتا ہے۔ بآواز بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اس عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اُس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے دل کی بات بھی سن رہی ہے اوراس کو ایسی قدرت مطلقہ حاصل ہے کہ اُسے پکارنے والا جہاں بھی ہو، وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اوراس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔ دعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ وہ اُس ہستی کے اندر اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اس سے دعا مانگنے کا تصور تک کبھی اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

❷ ...... دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے، اس سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع مالکِ اختیارات ہو جائے۔ مالک اختیارات ہونا تو ایک امرِ واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں

ہے۔ جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے وہ بہر حال مالک ہی رہے گا، خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں اور جو حقیقت میں مالک نہیں ہے، اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے، اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کوئی حصہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ بات ایک امرِ واقعی ہے کہ قادرِ مطلق اور مدبرِ کائنات اور سمیع وبصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کلی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جو دعائیں سننے اور اُن پر قبولیت یا عدمِ قبولیت کی صورت میں کوئی کارروائی کرنے کا اختیارات رکھتی ہو۔ اس امرِ واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیاء اور اولیاء، فرشتوں اور جنوں، سیاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرّہ برابر بھی کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ مالک مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے، بندے ہی رہیں گے۔

❸ ...... تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکم ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں اُنہی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے، میری مراد آپ ہی بر لائیں گے تو بر آئے گی۔ یہ حرکت اول تو بجائے خود سخت حماقت وجہالت ہے، لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جبکہ اصل حاکم ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جا رہی ہیں۔ پھر یہ جہالت اپنے کمال پر اس وقت پہنچ جاتی ہے جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جا رہی ہے وہ خود بار بار اس کو سمجھائے کہ میں تو

خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں ، میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔'' ❶

یہاں بجا طور پر سوال ہوسکتا ہے کہ غیر اللہ کو غیب میں پکارنا کیوں منع ہے؟ کوئی اُن کو ''الٰہ'' (معبود) تو نہیں سمجھ رہا ہوتا؟

یہ سوال اگر واقعی نیک نیتی سے کیا جائے اور مقصد سمجھنا ہو تو بہت اچھی بات ہے کیونکہ نا سمجھی میں ایسی بات ہوجائے اور پھر قیامت والے دن اللہ کے سامنے شرمندگی ہو اور کوئی عذر نہ بن سکے۔

کیا پکارنا (ندائے غیر اللہ) شرک نہیں......؟

نداء غیب ، غیبی پکار، غیب میں یا مافوق الاسباب طریقہ سے پکارنا، اور اپنی مشکلات اور حاجات میں مدد طلب کرنا، یہ عبادت ہے بلکہ حدیث میں اسے عبادت کا مغز کہا گیا ہے یعنی دعا (پکارنا) عبادت کا مغز ہے۔ ❷ نیز ''اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ'' دعا ہی عبادت ہے۔'' دیکھا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں پڑھے لکھے افراد بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے مدد مانگتے ہیں، تعاون کرتے ہیں بلکہ ایک پروفیسر صاحب نے مجھے راول پنڈی کے ایک کالج میں کہا کہ ''ابھی آپ نے زمرد سے چائے نہیں مانگی؟'' مقامِ حیرت ہے کہ پڑھے لکھے افراد بھی اللہ سے مانگنے اور ملازم سے چائے مانگنے کو ایک درجہ پر رکھتے ہیں۔ یاد رکھیے......! کہ تمام طرح کی مدد وامداد دنیا میں وسائل کی محتاج ہے۔ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو غریب کی مدد کریں گے، کسی لڑائی جھگڑے میں اگر آپ مادی طاقت رکھتے ہیں تو آپ سے مدد طلب کی جائے گی، ممالک کی جنگ میں جس کے پاس

---

❶ تفہیم القرآن، جلد۴، ص ۱۹۔۴۱۸۔

❷ اسنادہٗ ضعیف۔

عسکری قوت زیادہ ہوگی وہ دوسروں پر حاوی ہو جائے گا۔ ❶

گویا دنیا کا نظام جس مدد وتعاون اور مخالفت ومخاصمت کی بنیاد پر قائم ہے وہ مادی قوت یا اسباب کی قوت ہے، اسی قسم کے تعاون کی قرآن حکیم نے بھی تلقین کی ہے، نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ ونافرمانی میں تعاون نہ کرو۔ ❷

چنانچہ اسباب یا وسائل کے حوالے سے مدد مانگنا ،شرک نہیں اور نہ مدد طلب کرنے والا، دوسرے کو الہ (معبود) خیال کرتا ہے۔

مدد کے لیے پکارنا اُس وقت شرک بنتا ہے اور انسان سمجھے نہ سمجھے وہ جسے مدد کے لیے غیب میں پکار رہا ہوتا ہے یعنی اُس کی عدم موجودگی میں فریاد اور التجا کر رہا ہوتا ہے تو وہ لازماً الہ (معبود) ہوتا ہے خواہ انسان کو اپنے فعل کا شعور ہو یا نہ ہو، چنانچہ کسی نبی، ولی، علی، حجر، شجر یا انسان کو اس کے فوت ہونے یا عدم موجودگی میں پکارنا، اور یہ خیال کرنا کہ وہ میری پکار سن رہا ہے یا میرے حال کو دیکھ رہا ہے اور میری مشکل دُور کرنے پر قادر ہے، یہ اُس کو 'الہٰ' کا درجہ دینے کے مترادف ہے اور یہی وہ پکار ہے جس سے قرآن حکیم بار بار منع کرتا ہے اور اسی غیبی پکارنے کو شرک قرار دیتا ہے۔ بعض مسلمان ،غیب میں بزرگ ہستیوں کو پکارتے ہیں اور اُن سے مدد طلب کرتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کوئی بھی مسلمان نماز کے بعد اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگ رہا ہو۔ وہ تمام حاجات اور مشکلات اللہ کے حضور پیش کرتا ہے اور اُسی سے اُن کے حل کی اُمید رکھتا ہے البتہ بعض لوگ ''وسیلہ'' کے تعلق سے دعا مانگتے ہیں جو ناسمجھی کی دلیل ہے۔جس پر بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ خود آپ، حضرت محمد ﷺ کا عمل دیکھیے کہ جنگِ بدر میں (کم وبیش) 313 افراد معمولی جنگی

---

❶ اور تمام تر طاقت کے باوجود افغانستان کی جنگ کی بنا پر سویت یونین ٹوٹ گیا اور امریکہ ذلیل وخوار ہوگیا۔ گویا عالمِ اسباب میں بھی اللہ کی مرضی ہی کو دخل ہے۔

❷ المائدہ: ۵/ ۲ .

سازوسامان کے ساتھ میدان میں اُتارے اور پھر دعا کی ''اے اللہ! تُو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا فرمادے۔

اے اللہ! تجھ سے تیرا عہد اور تیرے وعدے کا سوال کررہا ہوں۔'' جب گھمسان کی جنگ چھڑی تو آپ نے دعا کی ''اے اللہ! اگر آج یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے۔'' [1]

یہی نہیں تمام انبیاء علیہم السلام کی دعائیں آپ قرآن حکیم میں دیکھیں کہ وہ اپنی حاجات اور مشکلات میں صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اور بھی بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو حکم دیا ہے کہ مصائب ومشکلات یا کسی بھی نوعیت کی ضرورت کے تحت، صرف اُسے پکاریں اور جیسا کہ آخری آیت میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دعا وپکار کو عبادت قرار دیا گیا۔ چونکہ دعا میں انتہائی عاجزی اور بے بسی کا عنصر ہے، لہٰذا یہ بہت بڑی عبادت ہے۔ چنانچہ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ یہ ناپسند فرماتے ہیں کہ اُس کا بندہ، کسی دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، یہ غیرتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ چنانچہ جہاں ''امر'' ہے، وہاں اسی معاملہ میں ''نہی'' بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ واضح طور پر منع فرماتے ہیں کہ کسی دوسرے کو (خواہ وہ کوئی بھی ہو) مت پکارو! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝﴾ [2]

''مسجدیں اللہ ہی کی ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ

[1] الرحیق المختوم، ص ۲۹۶۔

[2] الجن: ۷۲/ ۱۸.

يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ ❶

''اوراللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈال دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴾ ❷

''پس اے محمد! اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔''

کیا انبیاء سے شرک کا خطرہ ہوسکتا ہے......!

آیتِ بالا کی تفسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''اس کا مطلب نہیں کہ معاذ اللہ نبی ﷺ سے شرک کا خطرہ تھا اور اس بنا پر آپ کو دھمکا کر اس سے روکا گیا۔ دراصل اس سے مقصود کفار و مشرکین کو متنبہ کرنا ہے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو تعلیم پیش کی جارہی ہے یہ چونکہ خالص حق ہے، فرمانروائے کائنات کی طرف سے اور اس میں شیطانی آلائشوں کا ذرّہ برابر بھی دخل نہیں ہے، اس لیے یہاں حق کے معاملہ میں کسی کے ساتھ رعایت کا کوئی کام نہیں۔ خدا کو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق میں کوئی عزیز و محبوب ہوسکتا ہے تو وہ اس کا رسول پاک ہے لیکن بالفرض اگر وہ بھی

❶ یونس: ١٠/ ١٠٦۔١٠٧.	❷ الشعراء: ٢٦/ ٢١٣.

بندگی کی راہ میں بال برابر ہٹ جائے اور خدائے واحد کے سوا کسی اور کوئی معبود کی حیثیت سے پکار بیٹھے تو پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ تابدیگراں چہ رسد۔ اس معاملہ میں جب خود محمد ﷺ کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تو اور کون ہے جو خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک ٹھہرانے کے بعد یہ اُمید کرسکتا ہو کہ خود بچ نکلے گا یا کسی کے بچانے سے بچ جائے گا؟'' ❶

غیر اللہ کی پکار میں دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

❶ ...... ملکیت ❷ ...... قوت وطاقت (تصرف کی)

کوئی نادان سے نادان شخص بلکہ بچہ بھی ایسے شخص سے مادی زندگی میں بھی کچھ نہیں مانگتا جس کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہو یا پھر دینے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو، ایک چھوٹا بچہ بھی جب خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنے جیسے بچے کے پاس جانے کے بجائے اپنے بڑے کے دامن میں پناہ لیتا ہے، بالکل یہی حالت اُن افراد کی ہے جو غیبی پکار کے ذریعہ اپنے باطل معبودان کو پکارتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اُن کے پاس وہ تمام اشیاء یا مال و اسباب یا اولاد وغیرہ ہے جو وہ انہیں دینے پہ قدرت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی ہی کسی بھی غیر اللہ کے پاس، اسباب سے ماورا کسی کو دینے کے لیے کچھ ہے؟ اور کیا وہ قوت و طاقت کا حامل ہے کہ اسباب ووسائل کی عدم موجودگی میں حاجت روائی اور مشکل کشائی کرسکے؟

خیال وقیاس آرائی کے بجائے کیوں نہ اپنے دونوں سوالوں کو ایک بار پھر قرآن حکیم پر پیش کریں اور پوچھیں کہ اے اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ میں ''الٰہ'' ہوں اور میرے سوا کوئی بھی دوسرا 'الٰہ' (معبود) نہیں تو کیا کسی کی 'مِلک' میں کچھ ہے یا نہیں اور کیا اِس کے پاس طاقت ہے کہ وہ بغیر اسباب ووسائل کے کائناتی نظام میں اپنی مرضی سے تصرف کرسکے؟

❶ ملکیت:

قرآن حکیم بار بار اِس بات پر زور دیتا ہے کہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے وہ صرف

❶ تفہیم القرآن جلد ۳، ص ۴۲-۵۴۳۔

اور صرف اللہ کی ''مِلک'' ہے۔ اس موضوع پر اس قدر آیات ہیں کہ احاطہ کرنا مشکل ہے۔
چند آیات ملاحظہ ہوں:

① ﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ❶

''اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

② ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ❷

③ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ❸

''اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

④ ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ❹

''اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا۔''

⑤ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ ❺

''اور اللہ ہی کی مِلک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں اور زمین ہیں اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔''

زمین وآسمان کی ملکیت کا دعویٰ بے دلیل نہیں، بلکہ اس دلیل پر قائم ہے کہ چونکہ خود اللہ ان کا خالق ہے، تخلیق میں چونکہ اُس کے کوئی شریک نہیں لہٰذا خود بخود یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ پھر ملکیت میں کوئی شریک نہیں، اس رُخ پر ذرا مزید بڑھیں تو چونکہ خالق وہی ہے، لہٰذا مالک وہی ہے تو پھر ''الٰہ'' بھی وہی ہے اور ''بادشاہ'' بھی وہی ہے۔ غرض ہر لحاظ سے حاکمیتِ اعلیٰ صرف اُسی کے لیے خاص ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ ❻

---

❶ البقرہ: ۲/ ۲۵۵۔ ❷ البقرہ: ۲/ ۲۸۴۔
❸ آل عمران: ۳/ ۱۲۹۔ ❹ آل عمران: ۳/ ۱۸۰۔
❺ النساء: ٤/ ۱۳۲۔ ❻ البقرہ: ۲/ ۱۰۷۔

''کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ زمین و آسمان میں بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے؟ اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے والا اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ [1]

''آسمانوں اور زمین کی سلطنت، اللہ ہی کے لیے ہے۔ جو چاہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے یا دونوں ملا کر بیٹے اور بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ علم اور قدرت والا ہے۔''

کتنا واضح ہے کہ زمین و آسمان کی فرماں روائی بھی اس کی ہے اور اولاد دینا نہ دینا بھی اُس کی مرضی پر منحصر ہے، ہمارے یہاں لوگ اولاد کے لیے غیر اللہ کے در پر مارے مارے پھرتے ہیں حالانکہ وہ اولاد تو انھیں بھی دے رہا ہے جو اُسے مانتے تک نہیں یا شرک کرتے ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے دیکھا کہ زمین و آسمان اللہ کے ہیں، اُن میں بادشاہی یعنی اقتدار و اختیار صرف اُسی کا ہے۔ آیئے! ایک آدھ مثال یہ بھی دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہی میں کسی کو شریک ٹھہرایا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً

[1] الشوریٰ: ۴۲/ ۴۹-۵۰.

لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا﴿۳﴾ ﴾ ❶

''بہت بابرکت ہے، وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان (حق وباطل میں تمیز کرنے والا) اُتارا تا کہ لوگوں کو خبردار کرنے والا ہو، وہ زمین وآسمان کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا، اور نہ اس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اُس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ لوگوں نے اُسے چھوڑ کر دوسرے ایسے الہ (معبود) ٹھہرا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مارسکتے ہیں نہ زندگی دے سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو دوبارہ اُٹھانے پر قادر ہیں۔''

غور فرمائیے......! مندرجہ بالا آیات صرف بادشاہی کو اللہ سے خاص نہیں کرتیں بلکہ واضح کرتی ہیں کہ کوئی اس کی بادشاہی میں شریک بھی نہیں، باقی رہے لوگوں کے الہ (معبود) تو وہ مخلوق ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، وہی ان کی جان لے گا اور قیامت کے دن اٹھائے گا، جب ساری قوتیں اور طاقتیں اللہ کے لیے ہیں تو پھر کوئی دوسرا الہ کیسے ہوسکتا ہے؟

لفظِ مُلک کی وضاحت:

آیت نمبر ۲ کی تفسیر کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں:

''اصل میں لفظ مُلک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت (Sovereignty) کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مطلق ہے اور فرماں روائی کے اختیارات میں ذرّہ برابر کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اس بات کو مستلزم ہے

❶ الفرقان: ۲۵/ ۱۔۳۔

کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان جس کو بھی معبود بناتا ہے یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی قسم کا کوئی نفع ونقصان پہنچاسکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھا بُرا اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو ملجا و ماویٰ بنانے کے لیے کوئی احمق سے احمق شخص بھی تیار نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا اس کائنات میں کسی کے پاس بھی کوئی زور نہیں ہے، تو پھر نہ کوئی گردن اُس کے سوا کسی کے آگے عجز ونیاز کے لیے جھکے گی نہ کوئی ہاتھ اُس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لیے بڑھے گا۔ نہ کوئی زبان اس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی یا دعا والتجا کے لیے کھلے گی اور نہ دنیا کے نادان سے نادان آدمی سے بھی کبھی یہ حماقت سرزد ہوسکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت وبندگی بجالائے، یا کسی کو بذاتِ خود حکم چلانے کا حق دار مانے۔ اس مضمون کو مزید تقویت اوپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے اور اسی کے لیے ہے۔'' [1]

اور اسی بنیادی، ابدی اور عالم گیر حقیقت پر قرآن حکیم کا اختتام ہوتا ہے کہ تمام تر بالا تر حیثیتیں اور مرتبے صرف اور صرف اللہ کے لیے ہیں اور خاص طور پر رسول پاک ﷺ سے کہا گیا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں، جو تمام انسانوں کا رب (پالنے اور پرورش کرنے والا) ہے۔ مَلِک (مالک یا بادشاہ حقیقی) ہے اور الٰہ (معبودِ برحق) ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر نبی پاک ﷺ ایسے آقا و مالک کی پناہ طلب کرتے اور اُس کی پناہ میں آتے ہیں تو پھر جو غیراللہ سے مشکلات وخطرات اور مصائب میں پناہ طلب کرے وہ بیک وقت اللہ اور رسول ﷺ کے حکم اور سنت کی خلاف ورزی کرتا ہے، یہاں وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ یعنی شیطان سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ

[1] تفہیم القرآن جلد۳، ص۴۴۳،۴۴۳۔

میں آنے، اور وہ یہی وسوسے ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے اور قریبی لوگوں کے پاس بھی تمھاری مشکلات کا حل ہے، وہ غیب میں تمھاری مدد کر سکتے ہیں، جو لوگ صرف اللہ سے مدد کا کہتے ہیں، یہ وہابی ہیں، نجدی ہیں، ان کی باتوں میں نہ آنا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خود نبی پاک ﷺ کو توحید کی اسی دعوت پر رَد کر دیا گیا اور آپ ﷺ کو یہی باتیں سننی پڑیں، ایک مشہور واقعہ پیش خدمت ہے۔

دعوتِ توحید اور رسول پاک کی بے قراری:

''ابن اسحاق وغیرہ کا بیان ہے کہ جب ابوطالب بیمار پڑ گئے اور قریش کو معلوم ہوا کہ اُن کی حالت غیر ہوتی جاتی ہے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو سیّدنا حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما مسلمان ہو چکے ہیں اور محمد ﷺ کا دین قریش کے ہر قبیلے میں پھیل چکا ہے۔ اس لیے چلو ابوطالب کے پاس چلیں کہ وہ اپنے بھتیجے کو کسی بات کا پابند کریں اور ہم سے بھی اُس کے متعلق عہد لے لیں کیونکہ واللہ! ہمیں اندیشہ ہے کہ لوگ اُس کی وفات کے بعد ہمارے قابو میں نہ رہیں گے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بڈھا مر گیا اور محمد (ﷺ) کے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہوگئی تو عرب ہمیں طعنہ دیں گے، کہیں گے کہ انھوں نے محمد (ﷺ) کو چھوڑے رکھا (اور اُس کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہ کی) لیکن جب اس کا چچا مر گیا تو اس پر چڑھ دوڑے۔

تقریباً پچیس افراد جن میں زیادہ تر سردارِ قریش تھے، جناب ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ ''وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم اُن کو اُن کے دین پر چھوڑ دیں'' جناب ابوطالب نے آپ ﷺ کو بلایا اور کہا یہ تمھاری قوم کے معزز لوگ تمھارے لیے جمع ہوئے ہیں اور پھر اُن کا مدعا بیان کیا۔ آپ ﷺ نے وفد کو مخاطب کر کے فرمایا:

''آپ لوگ یہ بتائیں کہ اگر میں ایک ایسی بات پیش کروں جس کے اگر آپ

قائل ہوجائیں، تو عرب کے بادشاہ بن جائیں اور عجم آپ کے زیرِ نگیں آجائے تو آپ کی کیا رائے ہوگی؟" بعض روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ابوطالب کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں ان سے ایک ایسی بات چاہتا ہوں کہ جس کے یہ قائل ہوجائیں تو عرب ان کے تابع فرماں ہوجائیں اور عجم انھیں جزیہ ادا کریں۔" ایک اور روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "چچا جان! آپ کیوں نہ انھیں ایک ایسی بات کی طرف بلائیں جو اِن کے حق میں بہتر ہو۔" انھوں نے کہا تم کس بات کی طرف بلانا چاہتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں ایک ایسی بات کی طرف بلانا چاہتا ہوں جس کے یہ قائل ہوجائیں تو عرب اِن کے تابع فرمان بن جائے اور عجم پر اِن کی بادشاہت قائم ہوجائے۔" ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "آپ لوگ صرف ایک بات مان لیں جس کی بدولت آپ عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور عجم آپ کے زیرِ نگیں آجائے گا۔" وفد حیران و پریشان ہوگیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ صرف ایک بات اور اتنی مفید اور نتیجہ خیز، آخر ابوجہل نے کہا: اچھا بتاؤ وہ کیا بات ہے؟ تمھارے باپ کی قسم! ایسی ایک تو کیا دس باتیں بھی پیش کرو تو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آپ لوگ لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰــه کہیں اور اللہ کے سوا جو کچھ پوجتے ہیں، چھوڑ دیں۔" اِس پر انھوں نے ہاتھ پیٹ پیٹ کر اور تالیاں بجا بجا کر کہا کہ محمد (ﷺ) تم یہ چاہتے ہو کہ سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالو؟ واقعی تمھارا معاملہ عجیب ہے۔ پھر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے "خدا کی قسم! یہ شخص تمھاری کوئی بات ماننے والا نہیں، لہٰذا چلو اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ڈٹ جاؤ۔" ❶

---

❶ الرحیق المختوم، ص ۱۶۴،۶۵۔

قدیم و جدید مشرکوں کے شبہے کا ازالہ:

اِس واقعہ کے بارے میں قرآن حکیم نازل ہوا جس میں ایک آیت یہ بھی تھی کہ:

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ ﴾ [1]

''کیا اس نے بہت سارے معبودوں کی جگہ بس ایک ہی معبود بنا ڈالا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے!''

''کنز الایمان'' کے حاشیہ میں سید محمد نعیم الدین نے ایک فقرہ کا مزید اضافہ کیا ہے اور جس سے مشرکینِ مکہ کے ذہن کی مکمل عکاسی ہوجاتی ہے کہ ''اتنی بہت سی مخلوق کے لیے ایک خدا کیسے کافی ہوسکتا ہے......؟'' (ص۸۱۵)

گویا مشرکین نے جو بہت سارے باطل معبودان بنا رکھے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ہمدردی میں بنا رکھے تھے کہ اتنی ساری مخلوق کے تمام کاموں کا بوجھ وہ اکیلے اللہ پر نہیں ڈال سکتے تھے شاید وہ انھیں اُٹھانے کی طاقت نہ ہو۔

یہ تصورِ ''الٰہ'' واضح طور پر مشرکین کی ذہنی پسماندگی کی علامت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وقوت اور عظمت وشان سے بے بہرہ تھے اور شاید وہ اپنی روایت کے پس منظر میں کچھ زیادہ قصوروار بھی نہ تھے کیونکہ انسان عام طور پر اپنے آباؤاجداد کے دین کی پیروی کرتا ہے اور اُسے صحیح سمجھ کر پیروی کرتا ہے کیونکہ دین و مذہب کے معاملہ میں منافقت شاذ ہی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کو آخرت میں جواب دہی کا احساس ہے وہ تو قطعاً بدنیتی پر مشتمل رویہ اپنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ آج بھی جو افرادِ ملت الٰہ واحد کے ساتھ دوسرے الٰہوں کو پکارتے ہیں، وہ انھیں اپنا معبود خیال کریں نہ کریں حقیقتاً غیبی پکار مدد وامداد کی، مطلوب کو الٰہ بنا دیتی ہے، مشرکین کے اِس تصور کے برعکس کہ ایک خدا سارے کاموں کے لیے ناکافی ہے۔ مسلمان کی سوچ دیکھیے، میاں محمد اکرم ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''کائنات میں جو لاکھوں کروڑوں قسم کے مختلف نظام کارفرما ہیں وہ صرف

---

[1] ص: ۳۸/ ۵.

اور صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی چل رہے ہیں، اللہ اسمِ ذات ہے، وہ ذاتِ اقدس جو تمام کمالات وصفات کی جامع ہستی ہے۔ اللہ کے مقابل اور ان معنوں اور صفات میں اللہ کا کوئی متبادل لفظ کسی کتاب وڈکشنری یا انسائیکلوپیڈیا میں نہیں مل سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسم اللہ کا دنیا کی کسی بھی زبان میں ترجمہ ممکن ہی نہیں۔" ❶

سچ تو خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾

"اُن لوگوں نے اللہ کی قدر پہچانی ہی نہیں جیسا کہ پہچاننے کا حق تھا۔"

ملکیت کے بارے میں تو آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے ثابت نہیں بلکہ قرآن پاک نے تو غیر اللہ سے مِلک وملکیت کی نفی میں حقیقت بیانی کے اُس مرتبہ کو چھو لیا جسے ہم عرفِ عام میں "مبالغہ" سے تعبیر کرتے ہیں مگر یہاں یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ غیر اللہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۞ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۞﴾ ❷

"وہ (اللہ ہی ہے) رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقتِ مقررہ تک رہے گا۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے، بادشاہی اُسی کی ہے اور اُس کے سوا جن

❶ سورج کا سفر، ص ۵۰، ۵۱۔ ❷ الفاطر: ۳۵/ ۱۳۔۱۴.

(معبودوں) کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔
اُنھیں پکارو تو وہ تمھاری دعائیں سن نہیں سکتے اور (بالفرض) سن بھی لیں تو
جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور
ایک خبردار کرنے والے کے سوا تمھیں (حقیقی صورتِ حال) کی ایسی خبر کوئی
اور نہیں دے سکتا۔"

اَب اس سے زیادہ اور کیا غیر اللہ کی بے وقعتی اور کمزوری ہوگی کہ وہ ایک بے حیثیت چیز (کھجور کی گٹھلی کا چھلکا) ایسی چیز کے مالک بھی نہیں اور نہ دعائیں قبول کرنے اور نہ اُن پر کارروائی کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور حیات بعد الممات، قیامت کے دن اس شرک کا انکار کریں گے کہ اُنھیں تو خبر ہی نہ تھی کہ کوئی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اُنھیں اپنی مشکلات اور مصائب میں پکارا کرتا تھا۔

اب آیئے آخر میں یہ دیکھیں کہ غیر اللہ کے پاس قوت وطاقت ہے کہ وہ اُس کے بَل بوتے پر دوسروں کی حاجت روائی یا مشکل کشائی کر سکیں۔

قرآن حکیم میں 49 مرتبہ "جَمِيْعًا" لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم ہمارے موضوع کے لحاظ سے یہ چار مقامات درج ذیل دیکھیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

① ﴿فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ﴾ [1]
"تمام عزت اللہ کے لیے ہے۔"

② ﴿قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا﴾
"کہہ دیں تمام شفاعت اللہ کے لیے ہے۔"

③ ﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [2]
"تمام طاقت اللہ کے لیے ہے۔"

---

[1] النساء: ٤/ ١٣٩. [2] البقرة: ٢/ ١٦٥.

۴ ﴿ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا ﴾ ❶

"بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

لیکن آپ جب قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ استثنا (Exception) لے آتا اور فرماتا ہے:

❶ ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ ❷

"عزت تو اللہ، اُس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے ہے۔"

❷ ﴿ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ ﴾ ❸

"اُس دن سفارش کچھ کام نہ آئے گی مگر جسے رحمٰن حکم دے اور اُس کی بات پسند فرمائے۔"

مندرجہ بالا آیات اور ایسی ہی بعض دوسری آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "عزت" اور "شفاعت" میں دوسروں کو شریک کرلیا ہے۔ شفاعت کے ساتھ "اذن" کی شرط بھی اس لیے ہے کہ مشرکین نے اپنے بتوں کو بھی سفارشی بنا رکھا تھا اور انھیں جب کہا جاتا کہ تم ان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ بقول قرآن مجید جواب دیتے ہوئے کہتے کہ:

﴿ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی ۭ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ ﴾ ❹

"اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا اور دوست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنادیں، تو جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں اللہ ان کا فیصلہ کردے گا۔ بے شک اللہ اس شخص کو ہدایت

❶ الرعد : ۱۳/ ۳۱.
❷ المنافقون : ۶۳/ ۸.
❸ طٰہٰ : ۲۰/ ۱۰۹.
❹ الزمر : ۳۹/ ۳.

نہیں دیتا جو جھوٹا ناشکرا ہے۔"

اور کبھی وہ یوں کہتے ہیں کہ:

﴿هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ❶

"یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔"

گویا بتوں کو یا بتوں کے پسِ پشت جو افراد تھے، انھوں نے اِنھیں وسیلہ بنا رکھا تھا کہ ہم تو صرف اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ یہ محض وسیلہ ہیں، قربتِ خداوندی کا یا سفارشی یا شفاعت کرنے والے ہیں۔

ایک اور غلط فہمی کا ازالہ:

سید سلیمان ندوی کے بقول:

"شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے، اس کا اصل سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت اُن کے ذہن میں قائم تھا۔ وہ خدا اور بندے کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر اور جابر بادشاہ اور اُس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح دنیوی بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی، دربار میں سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اُسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی اس کے سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اِن درمیانی ہستیوں کو خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے۔" ❷

اللہ تعالیٰ نے ان مشرکانہ تصورات سے بیزاری کے لیے اپنی پسندیدگی اور اجازت کی

---

❶ یونس: ۱۰/ ۱۸.

❷ سیرت النبی، جلد چہارم، ص ۴۳۹۔

شرط عائد کردی۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے 'عزت' اور 'شفاعت' کے ساتھ "جمیعا" کی تخصیص ختم کرکے اِسے اپنے رسول ﷺ اور مومنین کے لیے عام کردیا بلکہ ایک مقام پر تو پوری نوعِ انسان کے بارے میں فرمایا کہ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ ہم نے نوعِ انسانی کو فضیلت بخشی"، اِس طرح شفاعت کو اپنی اجازت سے مخصوص کرتے ہوئے رسول پاک ﷺ اور دوسرے نیک اور صالح افراد کو اس کا اختیار دینے کا اعلان کردیا۔

البتہ "قُوۃ" لفظ قرآن حکیم میں 28 مرتبہ استعمال ہوا مگر کوئی ایک بیان بھی قرآن پاک یا احادیثِ رسول ﷺ میں نہیں ملتا کہ کسی کو اسباب و وسائل سے ماورا ایسی قوت یا طاقت دی گئی ہو جیسے اللہ کے پاس ہے۔ یعنی اسباب کے بغیر تخلیق و تصرف مخلوق کو وسائل واسباب میں قوت دی گئی بلکہ مسلمانوں کو خاص طور پر قوت اور گھوڑوں سے دشمن کے مقابل تیار رہنے کی تلقین کی گئی۔ مخلوق میں سے جنوں [1] کو اضافی طاقت دی گئی، اِسی طرح فرشتوں کو بھی اُن کے منصب کے حوالے سے قوتیں عطا کی گئیں اور جبرئیل امین علیہ السلام کو شدید قویٰ اور عرش والا کے نزدیک طاقت ور قرار دیا گیا۔ بخاری و مسلم میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے دو مرتبہ جبرئیل علیہ السلام کو اصلی حالت میں دیکھا، اُن کی ہستی زمین و آسمان کی ساری فضا میں چھائی ہوئی تھی اور مسند احمد کی روایت کے مطابق اُن کے چھ سو "پَر" تھے۔

البتہ انسان کے بارے میں فرمایا گیا کہ ﴿وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾﴾ [2] اور

---

[1] جنوں کے حوالے سے ایک واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے، سرگودھا میں ایک حکیم مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ جن اُن کے موکل ہیں۔ میں نے انھیں کہا کہ آپ نے کتاب کے علم کا دعویٰ نہیں کیا ورنہ میں آپ سے کہتا کہ اسی وقت ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو یہاں لے آئیں جیسے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے مصاحب نے کہا، مگر جن نے بھی کہا تھا کہ محفل کے برخاست ہونے سے قبل میں تخت لا کے دیتا ہوں۔ ہم "جسدِ واحد" ہیں تو کیا آپ قوم کی بے گناہ اور مظلوم بیٹی کو امریکہ کی قید سے نہیں نکلوا سکتے؟ کہنے لگے جن ایسے کام نہیں کرتے، تو کیا وہ صرف قوم کے بیٹوں کو پاگل کرسکتے ہیں؟ جبکہ وہ حقیقت میں بیمار ہوتی ہیں۔ میں نے کہا ایک ارب اور بیس کروڑ مسلمانوں میں سے کاش کوئی ایک ایسا ولی کامل ہوتا جو یہ کارنامہ سرانجام دے دیتا ___ یا کوئی حجاج بن یوسف!

[2] النساء: ٤/ ٢٨.

انسان کو کمزور پیدا کیا گیا'' اور مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انسان کمزوری سے طاقت اور پھر کمزوری کی طرف سفر کرتا ہے اور آخر کار موت اُس سے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ طاقت اور قوت کو اللہ ہی سے خاص قرار دینے کے بارے میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

1. ﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ ❶

''وہی ہونا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اُس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔''

2. ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ ❷

''کیا اُنھیں نظر نہ آیا کہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے (بہت ہی) زیادہ زور والا ہے اور وہ ہماری آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔''

قومِ عاد سے خطاب ہے جنھوں نے اپنی مادی طاقت پر گھمنڈ کیا اور زور کی آندھی نے اُنھیں تباہ کر دیا۔

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴾ ❸

''اے گروہِ جن و انسان! اگر تم میں زمین و آسمان کے کناروں سے باہر نکل جانے کی طاقت ہے تو نکل بھاگو! اور بغیر غلبہ اور طاقت کے تم نہیں نکل سکتے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ ❹

''اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کا رزق رساں، طاقت والا اور زور آور ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

❶ الکھف: ۱۸/ ۳۹.
❷ حم السجدہ: ۴۱/ ۱۵.
❸ الرحمن: ۵۵/ ۳۳.
❹ الذریت: ۵۱/ ۵۸.

﴿ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۰۷ ﴾ ❶

''بے شک تمھارا رب جو چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔''

﴿ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝۱۱۶ ﴾ ❷

''زمین وآسمان کی ہر ہر چیز اُس کی ملکیت ہے اور ہر ایک اُس کے فرمان کے تحت ہے۔''

''جَمِيْعًا'' کے ساتھ چوتھی آیت یعنی ﴿ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ ﴾ ❸ ''سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے''...... مکمل طور پر یہ غیر اللہ سے اختیارات کی نفی کر کے شریک بنانے کے عمل کو باطل کر دیتی ہے اور عقلِ سلیم کو احساس دلاتی ہے کہ جب غیر اللہ کے پاس سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں تو پھر غیر کے در کی گدائی چہ معنی است؟ اور اس سلسلہ میں بھی تو اللہ تعالیٰ نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی جس طرح ملکیت میں کوئی شریک نہیں، تخلیقِ حیات و کائنات میں کوئی ساجھی نہیں، مخلوق بھی اُسی کی اور حکم بھی اُسی کا۔ تو یہاں بھی نہایت واضح فرمایا:

﴿ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶ ﴾ ❹

''وہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

دنیوی و اخروی تمام اختیارات اللہ کے پاس ہیں:

اب اس کے بعد بھی اگر کسی عقل کے اندھے کو سمجھ نہ آئے اور وہ غیر اللہ کے پاس مافوق الاسباب قوتیں اور اختیارات تسلیم کرنے اور اپنی حاجات و مشکلات میں غیب میں غیر اللہ کو پکارے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے نہ اپنی قدر و قیمت پہچانی، نہ اپنے خالق و مالک کی نہ ہی اپنے نبی پاک ﷺ کی۔ بقول عابد نظامی: ؎

کتنا جاں بخش ہے یہ تیرے نبی کا فرماں
تیری مخلوق کرے صرف عبادت تیری

❶ هود: ۱۱/ ۱۰۷. ❷ البقرہ: ۲/ ۱۱٦.
❸ الرعد: ۱۳/ ۳۱. ❹ الکهف: ۱۸/ ۲٦.

غرض یہ کہ اصلی اور حقیقی طاقت واختیار، کلّی طور پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اُس نے انسانوں، جنوں کو اُن کے کام کاج یا ذمہ داریوں کے حوالے سے اسباب و وسائل میں قوت وطاقت سے نواز رکھا ہے۔ مگر یہاں بھی صورتِ حال یہ ہے کہ اسباب ووسائل بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں، لہٰذا جیسا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اُسی قسم کے نتائج اُن سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی سعی وکوشش کبھی مثبت نتائج پیدا کرتی ہے اور کبھی رائیگاں چلی جاتی ہے، ضروری نہیں کہ جو بوئے وہ کاٹے بھی، اور یہ جو قرآن حکیم میں کہا گیا کہ ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے'' تو آگے آیت ہے کہ ''اُس کی کوشش دیکھی جائے گی''، سیاق وسباق میں یہ آیت دنیا کے بجائے آخرت کے بارے میں ہے، کیونکہ اللہ کی راہ میں سعی وکوشش کے باوجود اگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکیں، دنیا میں تو ایسا شخص کامیاب نہیں ہوا، مگر اللہ تعالیٰ اس کی کوشش دیکھے گا کیونکہ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ چنانچہ اُس کی کوشش اور نیت پر آخرت میں نتائج سامنے آئیں گے، تو جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہوگی، وہ بھی دیکھ لے گا اور آج تو انسان شرک کرتا ہے، غیر اللہ کے پاس قوت و طاقت سمجھ کر اُنھیں اپنی مشکلات میں پکارتا ہے مگر قیامت والے دن اُس پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ طاقت تو صرف اللہ کے پاس تھی۔ چنانچہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے گلہ کرتا ہے کہ انھوں نے کیوں اللہ کے مقابل (ند) بنا رکھے ہیں؟ اگر وہ آج آگاہ ہوجاتے تو غیر اللہ سے اُمیدیں وابستہ نہ کرتے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾﴾ [1]

---

[1] البقرہ: ۲/ ۱۶۵.

''اورلوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اسی کا ہم پلہ (ند و مقابل) بناتے ہیں اور اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے ہونی چاہیے۔ (مگر) ایمان والے اللہ سے شدید (اشد) محبت کرتے ہیں۔ کاش کہ ظالم (مشرک) لوگ جان لیں جیسا کہ عذاب دیکھ کر جان لیں گے کہ تمام طاقت اللہ کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

یہاں دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربانی فرمانے کی غرض سے اُس حقیقت کا شعور دلا رہے ہیں جس کا شعور مشرکین قیامت والے دن کریں گے کہ طاقت تو صرف اللہ کے پاس تھی اور وہ غیر اللہ کو قوی اور طاقت ور خیال کرتے رہے اور اُسی دن یہ شعور بھی لوگوں کو ملے گا کہ، فرمانِ ربانی ہے:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [1]

''آج کس کی بادشاہی ہے......؟ صرف اللہ واحد وقہار کی۔''

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ﴾ [2]

''(یہ وہ) دن (ہوگا) جب کوئی شخص کسی شخص کے لیے کچھ نہ کر سکے گا اور حکم (فقط) اللہ ہی کا ہوگا (دنیا میں جو مادی اسباب و وسائل میں طاقت ہے وہ بھی نہیں ہوگی، مکمل بے بسی)۔''

خدائی ارادہ و مشیت:

یہ وہ چند حقائق ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ الوہیت میں اللہ کا کوئی شریک یا مقابل نہیں اور انسان کو صرف وسائل واسباب کے حوالے سے طاقت وقوت دی گئی ہے مگر اُن میں بھی کسی اثر پذیری کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے چاہنے، نہ چاہنے پر ہے۔ چنانچہ اسی شعور کے ساتھ مسلمان زندگی بسر کرتا ہے اور وہ تمام تدابیر اور محنت ومشقت کرنے کے بعد نتائج کی بہتری کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور ان شاء اللہ کہتا ہے

[1] المومن: ۴۰/ ۱۶۔ [2] الانفطار: ۸۲/ ۱۹۔

اوراس ان شاء اللہ کہنے میں ہی ساری حکمت وبصیرت ہے۔ انسانوں کے چاہنے، نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اور اس حقیقت کی جانب قرآن حکیم واضح رہنمائی کرتا ہے کہ، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ ❶

''اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہیے۔''

﴿ وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ❷

''اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے۔''

اللہ کے چاہنے اور غیر اللہ کے چاہنے پر ابنِ کثیر نے سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۱، ۲۲) کی تفسیر میں وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جو اس موضوع پر ہیں، یہاں وہ ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو'' کی تفسیر کررہے ہیں۔ اَنْدَادً، نِدٌّ کی جمع ہے مراد مقابل، شریک یا برابر ٹھہرانا، ابن کثیر لکھتے ہیں:

''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے یوں کہہ جو اللہ تعالیٰ اکیلا چاہے۔'' (ابن مردویہ) ایسے تمام کلمات توحید کے سراسر خلاف ہیں۔ توحید باری کی اہمیت کے بارے میں یہ سب احادیث بیان ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی عبادت کرو یعنی اس کی توحید کے پابند ہو جاؤ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ شرک اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف

❶ الدھر: ۷٦/ ۳۰۔ ❷ التکویر: ۸۱/ ۲۹۔

(سیاہ) پتھر پر چل رہی ہو، قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی حیات کی، یہ بھی شرک ہے انسان کا یہ کہنا اگر یہ کتیا نہ ہوتی تو چور رات کو ہمارے گھر میں گھس آتے، یہ بھی شرک ہے۔ آدمی کا یہ قول کہ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چوری ہو جاتی یہ بھی شرک کا کلمہ ہے، کسی کا یہ قول کہ جو اللہ چاہے اور آپ، یہ بھی شرک ہے کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں نہ ہوتا۔ یہ سب کلمات شرک ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں، تو آپ نے فرمایا: ''کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے؟'' دوسری حدیث میں تم اچھے لوگ ہوتے اگر تم شرک نہ کرتے تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے۔

محدثِ شہر ابوالعالیہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اَنْــدَادًا" کے معنی شریک اور برابر کے ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تم توراۃ وانجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور لاشریک ہے، پھر جانتے ہوئے کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو؟''

✿...... اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام: مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل نے سیّدنا یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو، قریب تھا کہ وہ اس میں غفلت کریں تو سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے انھیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پر خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو۔ لہٰذا یا تو آپ کہہ دیجیے یا میں پہنچا دوں۔ سیّدنا یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت لے گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ دیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جائے، پس یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا، جب مسجد بھر گئی تو آپ اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر کے کہا اللہ تعالیٰ نے

مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ خود بھی عمل کروں تم سے بھی ان پر عمل کراؤں۔

❁......ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے اور غلام کام کاج کرے لیکن جو کچھ حاصل ہو اسے کسی اور کو دے دے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا، تمہیں روزی دینے والا، تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔'' [1]

اب صورتِ حال یہ بنتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا، سب اس کی مخلوق ہے، مخلوق فطری طور پر اس کی اطاعت گزار ہے۔ البتہ انسانوں اور جنوں کو ایک محدود دائرہ میں اختیار دیا گیا ہے۔ اس اختیار سے امتحان لازم آتا ہے اور یہی امتحان، دراصل عبادت ہے۔ جو افراد اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ جملہ مراسم عبودیت کے لائق صرف وہی ذات ہے اور مکمل مطیع وفرماں بردار (مسلم) بن جاتے ہیں، آخرت کی کامیابی انھیں کے لیے ہے اور جو اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی عبادت کرتے ہیں، ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور قیامت کے دن اُن کو اپنے سفارشی، حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ملیں گے بلکہ وہ اس شرک سے برأت کا اظہار کریں گے۔ لہٰذا راہِ صواب یہی ہے کہ صرف اور صرف اپنی ضروریات، حاجات اور مشکلات کے لیے غیب میں اللہ کو پکارا جائے۔ صرف اسی سے مدد مانگی جائے کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

خلاصہ کلام:

آیئے! توحید باری تعالیٰ کی اس گفتگو کو مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تفسیری اقتباس پر ختم کریں، آپ لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر، جلد اول، ص۱۱۶، ۱۱۷، دارالقدس، لاہور۔

”قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس بات میں اس کی خصوصیت ہے۔ وہ کہتا ہے ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے، یہ اس کی ذات ہے، جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاروں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے، دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کر لیا، تو تم نے اسے خدا یعنی شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی تلقین کی گئی اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ معنوں کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے یعنی ”صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں“ اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِ شرک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔“[1]

[1] أُمُّ الکتاب (تفسیر سورۂ فاتحہ، ص۱۹۳-۱۹۲) الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

"لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" پر ایک اور حملہ، فلسفہ کی جانب سے ہوا، جو مذہب کے تعلق سے رفتہ رفتہ علم الکلام بن گیا۔ اگر یہ حملہ، محض کلامی حدود میں رہتا تو اتنا نقصان دہ نہ ہوتا لیکن شومئی قسمت کہ اس کو ہمارے یہاں ایک متصوفانہ رنگ دے دیا گیا اور مزید ستم یہ ہوا کہ اس شاعری کا مؤثر وسیلہ بھی مل گیا جس کی وجہ سے اس نے توحید کے اسلامی تصور کو مجروح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

وحدت الوجود کا تصور اصلاً فلسفیانہ ہے اور یہ تقریباً تمام مذاہب میں موجود ہے، تاہم ابنِ عربی نے فلاطینوس مصری کے فلسفۂ اشراق کو قبول کیا جس کے مطابق کائنات، نورِ اول کی تجلیات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ قاضی قیصر السلام لکھتے ہیں:

> "نوفلاطونیت کا بانی فلاطینوس مصری ہے۔ اس مکتبِ فکر کا بنیادی مسئلہ وحدت الوجود ہے یعنی وجود دراصل واحد ہے اور تمام کائنات بہ صورت تجلیات اسی وجودِ واحد سے نکلی ہے اور اس کائنات کو بالآخر اسی وجودِ واحد میں گم ہو جانا ہے۔ اسلامی تصوف میں اس نظریہ کو "ہمہ اوست" بھی کہا جاتا ہے۔" [1]

فلاطینوس نے اس صدور کے تین مراتب بیان کیے ہیں، یعنی "ذاتِ احد" سے 'عقل' اور پھر عقل سے روح کا صدور ہوتا ہے، روح اگرچہ اپنے مبدائے حقیقی کی جانب واپس جانا چاہتی ہے، مگر وہ کثیف چیز یعنی مادے سے بھی تعلق قائم کر لیتی ہے، چنانچہ وہ تعمق و تفکر کے ذریعہ مادے سے نجات پا کر اصل سے مل جاتی ہے۔ محمد کاظم لکھتے ہیں:

> "انسانی سوچ میں مادے کے تصرف سے نجات پانے اور اپنے مبدائے حقیقی

[1] فلسفہ کے بنیادی مسائل، ص ۲۱۶۔

کی طرف پرواز کر جانے کے لیے جو بے قراری پائی جاتی ہے، اُسے فلاطینوس نے 'عشق' کا نام دیا ہے، جو آگے چل کر ابن سینا کے تصورِ عشق اور صوفیہ کے عشقِ حقیقی کی صورت میں نمودار ہوا۔'' [1]

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وحدت الوجود دراصل فلسفہ کا موضوع تھا، مگر ابن عربی اور بعد میں آنے والے افراد نے اِس انداز سے پیش کیا کہ اسے ''مذہبی'' بنادیا گیا اور پھر جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ مؤثر شاعرانہ پیش کش سے یہ مسئلہ ایسے لوگوں میں نفوذ کرگیا جو دراصل شریعت کی پابندیوں سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ اسی حقیقت کی جانب علامہ اقبال نے بھی واضح رہنمائی کی ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں، مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور مؤخرالذکر کا خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں جیسا کہ بعض صوفیاء سمجھتے ہیں، بلکہ شرک ہے۔ ہاں وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔'' [2]

ابن عربی صوفی کی کتاب فصول الحکم کی حقیقت کشائی:

اس غلطی یا غلط فہمی کی وجہ خود ابنِ عربی ہیں جنھوں نے ایک ایسے دعوے کے ساتھ کتاب ''فصوص الحکم'' پیش کی جس کی تصدیق ممکن نہیں، تاہم دلائل وشواہد اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے، اُن کا کہنا ہے کہ:

''امابعد! حمد و صلوٰۃ کے پس تحقیق میں نے ۶۲۷ھ محرم الحرام کے آخری عشرے میں شہر دمشق میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خواب میں اس کیفیت میں زیارت کی کہ آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں ایک کتاب ہے۔

---

[1] مسلم فکر وفلسفہ عہد بہ عہد، ص۱۷۹۔

[2] بحوالہ اساس فکرِ اقبال، مظفر حسین، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس ۷۔ فرینڈز کالونی ملتان روڈ لاہور۔

حضور ﷺ نے مجھے فرمایا: ''یہ کتاب فصوص الحکم ہے، اس کو لے لو اور اس کو لوگوں تک پہنچا دو تا کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں...... اور یہ جو کچھ مری انگلیاں تحریر کریں اور جو کچھ میری زبان بولے اور جو کچھ میرے دل میں ہو، ان سب میں مجھے حق تعالیٰ الہامِ ربانی سے مخصوص کرے۔ نیز فرشتے کا الہام میرے قلب میں ساتھ تائید حفاظتِ الٰہی کے ہو، تا کہ اس کتاب کے اظہار میں محض مترجم بنوں اور میرے نفس کا اس میں کوئی حکم اور دخل نہ ہو۔'' ❶

اسی نوع کا ایک دعویٰ فقہ حنفی کی کتاب ''دُرمختار'' کے بارے میں کیا گیا کہ ''کتاب دُرمختار باذن نبوی تالیف ہوئی۔'' ❷

ابنِ عربی کے خواب اور بیان کی صداقت اور عدم صداقت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے مگر ہم اپنے معلوم ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایک تو اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن حکیم اُمت کو دیا اور دوسرا اُن کے فرمودات، احادیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں، جن کو انتہائی مشقت سے جمع کیا گیا اور انتہائی کڑی شرائط سے رَدوقبول کیا گیا کہ شاید دنیا کا کوئی علم محنت اور شرائط میں اس کا مقابل نہ ہوسکے۔ پھر قرآن وحدیث کا انداز واسلوبِ بیان بھی سادہ، آسان مگر انتہائی جامع ہے۔ ان کے مضامین دنیا میں انسانی عمل کا ایسا رُخ متعین کرتے ہیں جس میں فلاح وخسران قدم بہ قدم چلتے ہیں اور دنیا میں آخرت کی تیاری کو مقصود قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ''فصوص الحکم'' کے بارے میں محمد ریاض قادری لکھتے ہیں: ''کتاب فصوص الحکم خاصی ادّق کتاب ہے۔'' ❸

---

❶ شرح فصوص الحکم والایقان، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، تالیف محمد ریاض قادری، ص ۴۱، ۴۲۔

❷ دُرمختار، ج ۱، ص ۱۱، بحوالہ حق کی تلاش، ارشاد اللہ مان، ص ۴۸۶۔

❸ فصوص الحکم ص ۴۳۔

پھر اگر آپ اس کے ادّق (مشکل ترین) مضامین کو لیں تو انسانی زندگی میں اس کا کوئی عملی پہلو بھی نہیں بلکہ انسان کے وجود سے ہی انکاری ہے۔ کیونکہ "وحدت الوجود" میں کسی دوسرے وجود کا موجود ہونا شرک ہے۔

آیئے! اب آپ کو مختصر طور پر "وحدت الوجود" کے بارے میں بتائیں، تاکہ آپ خود فیصلہ کر سکیں کہ کیا "وحدت الوجود" ایک درست نظریہ ہے؟ اور کیا توحید اور وحدت الوجود ایک ہیں.........؟

نظریہ وحدت الوجود ایک فریب:

ایک مثال لیجیے! آپ ایک کمرہ میں کرسی پر بیٹھے ہیں، سامنے میز رکھی ہے، نظر اُٹھاتے ہیں تو دروازے پر پڑتی ہے، دائیں طرف دیکھتے ہیں تو کھڑکی دکھائی دیتی ہے، اوپر نگاہ اُٹھاتے ہیں تو روشن دان موجود ہے اور آپ کے ساتھ ہی وہ الماری ہے جس میں آپ نے کتب رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب چیزیں لکڑی کی بنی ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ آپ نے مختلف اشیاء کے نام گنوا دیے مگر لکڑی کا ذکر نہیں کیا جو ان اشیاء کی "اصل" ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب! یہ تو سب لکڑی ہے تو آپ کہیں گے کہ اصل کے اعتبار سے تو لکڑی ہی ہے مگر مختلف شکلوں میں ڈھل کر اب اصل پر قائم رہتے ہوئے بھی میز، کرسی، دروازہ، کھڑکی وغیرہ کہلاتے ہیں۔

اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ وجود کے اعتبار سے تو ہر شے لکڑی ہے مگر شکل کے اعتبار سے کوئی شے کرسی ہے تو کوئی میز، بس یہی وحدت الوجود ہے کہ وجود کے اعتبار سے تو ہر شے اللہ ہے کیونکہ وجود واحد ہے، مگر شکل یا ذات کے اعتبار سے کوئی انسان ہے، کوئی شیر، کوئی گھوڑا یا چرند و پرند وغیرہ۔ زیادہ واضح الفاظ میں بیک وقت ایک چیز مثلاً انسان، اللہ بھی ہے اور نہیں بھی، وجود کی جہت سے تو انسان اللہ ہے مگر ذات یا شکل کے لحاظ سے وہ اللہ نہیں، انسان ہے۔ ابنِ عربی لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ باعتبار تقید و تشخص وہ ہماری عین ہویت ذات نہیں، پس ایک

اعتبار سے عین ہوا اور ایک اعتبار سے غیر ہوا۔''❶

اب سوال یہ ہے کہ اگر انسان ،اللہ ہے تو عابد اور معبود کی تفریق کیوں؟اس کا جواب یہ ہے کہ جو شے جس تعین (شکل) میں آجاتی ہے، اس پر قانون، اصل یا وجود کے اعتبار سے نہیں بلکہ ذات یا شکل کے اعتبار سے لاگو ہوتا ہے۔ مثلاً کرسی، لکڑی ہے مگر اس سے آپ روٹی پکانے کے لیے آگ نہیں جلا سکتے کیونکہ لکڑی کے اس تعین پر قانون بیٹھنے کا لاگو ہوگا، اسی طرح انسان وجود کے اعتبار سے اللہ ہے مگر شکل یا تعین کے اعتبار سے انسان ہے۔ لہٰذا معبود نہیں بن سکتا، عابد ہوگا۔ یہاں پھر شاید یہ اشکال آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اگر اصول ''لَا مَـوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰه'' ہے اور وجودِ واحد ہے،دوسرا کوئی وجود سرے سے موجود ہی نہیں تو پھر بقول مرزا غالب ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پَری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ایک سیدھا سادا اور عام جواب تو یہ ہے کہ یہ سب اور دوسری اشیاء بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، بلکہ کل کائنات ،ارض وسما اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ،مگر وحدت الوجود کی رُو سے یہ جواب غلط ہے ۔یقین رکھیے کہ وحدت الوجود میں ''تخلیق'' کا لفظ اجنبی ہے۔ ابنِ عربی کا مشہور قول ہے:''اعیانِ ثابتہ نے خارج کی بُو تک نہیں سونگھی۔''

''اعیانِ ثابتہ'' تصوف کی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے،معلوماتِ الٰہی یا علمِ الٰہی۔ کائنات کی تخلیق سے قبل (ہماری زبان میں) اللہ تعالیٰ کے ذہن میں کائنات کا نقشہ ہوگا،

❶ فصوص الحكم، ص١٦٢.

یہ نقشہ، علمِ الٰہی ہے۔ ابنِ عربی کے بقول اس نقشہ (اعیانِ ثابتہ) نے خارج کی بُو تک نہیں سونگھی یعنی اب بھی جو کچھ ہے وہ اللہ کے ذہن میں ہی ہے، کچھ بھی تخلیق نہیں ہوا، یہ وہی خیال ہے جسے افلاطون عالمِ امثال (World of Ideas) کہتا ہے اور بشپ جارج برکلے حسی کائنات اورانفرادی اذہان کاانکار کرتا ہے،تو آخری جواب یہی دیتا ہے کہ سب کچھ خدا کے ذہن (God Mind) میں ہے۔ خارج میں کچھ نہیں۔ برکلے کی ایک دلیل ملاحظہ ہو:

> ''فی الفور مدرک مادی اشیاء کا وجود محض تصورات میں ہے مثلاً یہ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک مادی شے یعنی میز موجود ہے، تو اس کہنے سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ شے کچھ مخصوص صفات مثلاً صلابت، صورت، بو اور آواز وغیرہ کی حامل ہے۔ہم اس میز کے ادراک میں ان صفات کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں پاتے ۔چنانچہ معلوم یہ ہوا ہے کہ یہ صفات ماسوا صفات کے اور کچھ نہیں۔ لہٰذا کوئی چیز اپنے تجزیۂ آخری میں جز تصورات کے ایک بنڈل کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتی، اور یہ تصورات صرف ذہن یا نفس میں ہوتے ہیں۔ خارج از ذہن کچھ نہیں ہوتا۔''[1]

یہاں پھر ہمیں اُسی سوال کا سامنا ہے کہ: ؏

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ابن عربی، اشراقی فلسفی کے پس منظر میں اس کا جواب، وجود کے ''تنزلات'' اور ''تعینات'' کی صورت میں دیتے ہیں ،یہ تنزلات اور تعینات کیا ہے؟ انھیں سمجھنے کے لیے پھر ''لکڑی'' کی مثال ذہن میں لائیں۔

اصل وجود درخت یا لکڑی کا تھا، پھر وہ لکڑی مختلف اشکال میں ڈھل گئی ،کرسی، میز، الماری، دروازہ وغیرہ۔ پہلے درخت اپنے وجودِ کلی میں تھا، یہ اُس کی ایک شکل یا تعین تھا۔ جب اُسے کاٹ کے اُس کے چھٹے یا لکڑیاں بن گئیں تو وہ اپنے اصل وجود سے تنزل کر کے

[1] فلسفہ کے بنیادی مسائل، قاضی قیصر السلام، ص۹۰۔

پھٹوں کے تعین یا شکل میں آ گیا، پھر یہی پھٹے کرسی یا میز کے تعین یا شکل میں آ گئے، مزید کھڑکی یا الماریاں بن گئے۔ یعنی ان شکلوں یا تعینات میں آ گئے۔ گویا درخت ہی سفر کرنے یا تنزل کرتے کرتے مختلف اشکال (تعینات) میں ڈھل گیا، اب درخت سے بننے والی ہر شے اپنی اصل (وجود) کے اعتبار سے لکڑی ہے، مگر ذات یا شکل (تعین) کے اعتبار سے وہ خاص شے ہے۔ یہی وحدت الوجود ہے جس میں وجود کے چھ تنزلات ہیں جنھیں ''تنزلات ستہ'' کہا جاتا ہے۔ محمد ریاض قادری کی زبانی سنیے:

''حق تعالیٰ مرتبہ احدیت ذاتیہ (فیض اقدس) میں بطون در بطون تھا، اس کے اسماء وصفات اُس کی ذات میں بالقوہ (مخفی) موجود تھے۔ مرتبہ احدیت سے ذات سے تنزل فرما کر مرتبۂ وحدت میں ظہور فرمایا جو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس مرتبہ میں اسماء وصفات کا ظہور علمی اجمالی ہے۔ پھر اس مرتبہ سے تنزل فرما کر مرتبہ واحدیت میں ظہور فرمایا۔ اس مرتبہ میں صفات کا ظہور علمی تفصیلی ہوا۔ پھر اس مرتبہ سے تنزل فرما کر ذات سے عالمِ ارواح کی صورت پر ظہور فرمایا، اس مرتبہ سے تنزل فرما کر عالمِ مثال کی صورت پر ظہور فرمایا۔ پھر اس سے تنزل فرما کر عالمِ اجسام کی صورت پر ظہور فرمایا۔ اس مرتبہ اسماء وصفات کا ظہور خارجی تفصیلی ہوا۔ مرتبہ احدیت، وحدت اور واحدیت تینوں حقی مراتب ہیں جبکہ عالمِ ارواح، مثال اور اجسام خلقی مراتب ہیں۔ پھر حق تعالیٰ نے چاہا کہ ایک ایسی ہستی کو پیدا کیا جائے جو تمام حقی وخلقی کی جامع ہو اور اس کے تمام اسماء وصفات کی مظہر ہو اور وہ ہستی حق تعالیٰ کا ایک راز ہو، تو اس نے حضرتِ انسان کامل کو پیدا کیا۔ کون جامع سے مراد انسان کامل ہے اور یہ حقیقتِ محمدیہ ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں چھ مراتب کا ذکر ہے کہ وجود (اللہ) بتدریج تنزل فرماتا ہوا ہر

[1] شرح فصوص الحکم والایقان، ص ٦٠.

درجہ پر ایک خاص صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ان میں سے تین داخلی یا باطنی ہیں جبکہ تین خارجی یا ظاہری۔ ان کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

❶ احدیت:...... یہ وجود (اللہ) کے محض ہونے کا مقام ہے، یہاں کسی صفت کا اطلاق نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وجودِ مطلق بھی نہیں کہا جاسکتا۔

❷ وحدت:...... یہ وجود کا پہلا تنزل ہے یہاں ذات اپنی اجمالی صفات کے ساتھ ایک تعین پا رہی ہے۔ اسے مرتبہ کو ''حقیقتِ محمدیہ'' کا نام دیا گیا جو حد درجہ مبہم بیان ہے۔

❸ واحدنیت:...... یہ دوسرا تنزل ہے جس میں تفصیلی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔

❹ عالم ارواح یا روحوں کا عالم:...... یہ وجود کا خلقی مرتبہ ہے کہ وجود تنزل فرماتا ہوا عالمِ ارواح کے تعین میں اظہار فرماتا ہے۔

❺ عالم مثال یا عالم امثال:...... عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان یہ مرتبہ واسطہ یا ذریعہ ہے، جو کچھ کہ آخری مرتبہ پر اجسام کی صورت میں ظاہر ہوا، اُن کی مثل یا مثال اس عالم میں ہے۔ یہاں کثافت نہیں ہے۔

❻ عالم اجسام یا عالم ناسوت:...... ہمارا آپ کا عالم وجود کا آخری تنزل ہے۔ جس میں عالمِ امثال گویا اجسام میں مجسم ہوگیا۔ کثافت آ گئی۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ کائنات یا انسان کچھ اس انداز سے تخلیق نہیں ہوئے جیسے کہ ہم عام زبان میں کہتے ہیں کہ یہ کائنات اللہ نے بنائی ہے یا انسان کو پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے ''تخلیق'' کا لفظ ''وحدت الوجود'' میں اجنبی ہے۔ کائنات سے اللہ کا رشتہ خالق ومخلوق کا نہیں بلکہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کائنات اللہ ہے یا ہمہ اوست۔ یہاں بھی آپ کائنات یا ہمہ کو تسلیم کر رہے ہیں اگر یہ ہو تو پھر وحدت الوجود تو ختم، چنانچہ درست فقرہ ہوگا۔

① ...... اللہ عین کائنات ہے ② ...... اوست ہمہ

آپ دیکھ لیں کہ اللہ کا کائنات سے تعلق ''عینیت'' کا ہے، ''تخلیق'' کا نہیں اور ''ہمہ''

تو کچھ ہے ہی نہیں اوست ہی ہمہ ہے، وہی سب کچھ ہے۔ اس سلسلہ میں افراد کو خلق، تخلیق، عبد یا مخلوق کے الفاظ سے جو غلط فہمی ہوتی ہے۔ محمد ریاض قادری بجا طور پر اسی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شیخ اکبر جگہ جگہ حق اور خلق، عبد اور رب، مقید اور مطلق، حادث اور قدیم کے نام استعمال کرتے ہیں مگر وہ دوئی کے قائل نہیں۔ اُن کے مذہب میں دوئی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جہاں ایسے الفاظ ملیں اُن کے اعتباری معنی لیے جائیں۔ کیونکہ ان کے مذہب میں حقیقتِ واحدہ کے سوا کوئی چیز موجود نہیں۔ اس حقیقتِ واحدہ کو ایک اعتبار سے ہم خالق فاعل اور حق کے ناموں سے پکارتے ہیں اور دوسرے اعتبار سے اسی کو ہم خلق قابل [کذا] اور مخلوق کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔'' ❶

قادری کا عقائد ابن عربی کے لیے دفاع:

محمد ریاض قادری نے ابنِ عربی کے خیالات کی درست وضاحت کی ہے کیونکہ اگر 'رب عبد' میں فرق کرلیں یا خالق ومخلوق کا رشتہ قائم کریں تو پھر دوئی یا ثنویت لازم آتی ہے جو وحدت کی نفی کرتی ہے، لہٰذا ابنِ عربی کے مشہور اشعار جن کا مطلب ہے کہ رب، رب ہے، وہ خواہ کتنا تنزل کرے عبد نہیں بن سکتا اور عبد، عبد ہے، وہ خواہ کتنا صعود یا عروج پائے، رب نہیں بن سکتا، کو اسی اعتباری مفہوم میں لینا پڑے گا، اگر ظاہر مفہوم میں رب اور عبد کو دو الگ الگ ہستیاں مان لیں تو پھر وحدت الوجود ختم ہو جاتی ہے۔

محمد ریاض قادری کے اسی اقتباس میں وہ لفظ بھی موجود ہے جس کی جانب علامہ اقبال بھی اشارہ کر چکے ہیں اور وہ لفظ ''مذہب'' ہے۔ وحدت الوجود کو مندرجہ بالا پیراگراف میں ''مذہب'' قرار دیا گیا جبکہ یہ ابنِ عربی کا ''فلسفہ'' ہے۔ اس کتاب کے ایک اور مترجم مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی سابق صدر شعبۂ دینیات مکتبۂ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، نے

---

❶ شرح فصوص الحکم، ص۵۸.

مقدمہ میں دو عنوانات جلی حروف میں قائم کیے ہیں یعنی ''عقاید شیخ اکبر''، ص ۱۹، ''شیخ کا فلسفہ''، ص ۲۷۔

ابنِ عربی کے عقائد میں انھوں نے ''فتوحاتِ مکیہ'' سے طویل اقتباس نقل کیا ہے، چند سطور ملاحظہ ہوں:

''اللہ ایک ہے۔ الوہیت میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ بیوی بچوں سے پاک ہے، منزہ ہے۔ وہ سب کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہ ہے۔ اس کا کوئی وزیر نہیں، وہ کسی موجد کا محتاج نہیں۔ اللہ کے سوا جتنی چیزیں ہیں، وہ اپنے وجود میں سب اُس کی محتاج ہیں۔''

...... وہ تھا اور اُس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی۔ وہ قیوم ہے، اس پر سب کے قیام کا دارومدار ہے، وہ کبھی سوتا نہیں، وہ قہار ہے، اُس کی ساحت، عزت تک کسی کی رسائی نہیں، اس کا کوئی مثل نہیں، اُس نے عرش پیدا کیا اور استوا کو سلطنت کی حد بنایا۔ اُس نے کرسی پیدا کی، پست زمین اور بلند آسمانوں سے اُسے وسیع تر پیدا کیا۔ اُس نے لوح وقلم کو پیدا کیا اور روزِ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے، اپنے علم کے مطابق قلم سے لکھوایا، اُس نے بغیر کسی سابقہ نمونے کے عالم کو پیدا کیا، مخلوقات کو پیدا کیا، اُن کو کہنہ بھی کر دیا۔ ارواح کو اجساد میں امین بنا کر اُتارا۔ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے، اُس کو اپنی قدرت سے انسان کا مطیع بنا دیا...... سب کچھ اُس نے پیدا کیا اُس کو کسی کی حاجت نہ تھی ...... وہ تمام کلیات کو جانتا ہے، جیسے وہ تمام جزئیات کا علم رکھتا ہے...... پس وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ جن چیزوں سے لوگ شرک کرتے ہیں، اُن سے وہ اعلیٰ وارفع ہے...... کوئی اُسے ارادے سے روک نہیں سکتا، کوئی اُس کے حکم سے پیٹھ نہیں پھیر سکتا۔ جس کو چاہتا ہے ملک حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، ملک حکومت کو نکال لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا

ہے ذلت دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ جو چاہا ہوا، جو نہ چاہا، نہ ہوا۔ بغیر اللہ کے ارادے کے کوئی ارادہ بھی نہیں کرسکتا۔ بندے کسی کام کا لاکھ ارادہ کریں، جب تک خدا نہ چاہے، کام نہ ہوگا...... (یہاں اسی نوعیت کی کافی تفصیل ہے، اسے طوالت کے خوف سے ترک کر کے دوسرا عقیدہ لکھا جاتا ہے)...... دوسری شہادت ...... محمد ﷺ پر ایمان رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں پر بشیر ونذیر بنا کر بھیجا۔ آپ اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، آپ سراجِ منیر ہیں، شمعِ روشن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ پر اُتارا، اُس کی تبلیغ کی، اللہ کی امانت کو آپ نے ادا کیا...... آپ کی نصیحت کسی سے خاص نہ تھی، یہ سب بحکمِ احد وصمد تھا...... احکامِ نبوی میں سے جن کو جانتا ہوں، جن کو نہیں جانتا، سب پر ایمان ہے...... میں ایمان رکھتا ہوں وقتِ مقررہ پر، موت حق ہے۔ میں ایمان رکھتا ہوں کہ قبر میں منکر نکیر کا سوال حق ہے، اجساد کا قبروں سے بعث اور اُٹھنا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے عرض اور پیش ہونا حق ہے۔ حوضِ کوثر حق ہے، میزان حق ہے، اعمال ناموں کا اُڑ کر ہاتھوں میں آنا حق ہے، صراط پر سے گزرنا حق ہے، جنت بھی حق ہے، دوزخ بھی حق ہے......"[1]

مندرجہ بالا اقتباس اختصار کی کوشش کے باوجود طویل ہے مگر اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ابنِ عربی کے عقائد اور فلسفہ الگ الگ ہیں، البتہ دیانت داری کا تقاضا ہے کہ بتایا جائے کہ عقائد میں بھی ایک بیان ایسا آ گیا ہے جس سے پھر ذہن وحدت الوجود کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، ملاحظہ ہو:

"عالم بالذات معدوم ہے، غیر موجود فی الخارج ہے۔ اگرچہ ذاتِ الٰہی میں ثابت موجود ذہنی طور پر ہے۔"[2]

---

[1] فصوص الحکم، ص ۲۴۔۲۵۔ [2] فصوص الحکم، ص ۲۱۔

گو کہ مندرجہ بالا اقتباس ''فتوحاتِ المکیہ'' کا ہے، مگر فصوصِ الحکم کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہے کہ ''اعیانِ ثابتہ نے خارج کی بوتک نہیں سونگھی'' یعنی کچھ بھی خلق نہیں ہوا، اللہ کے ذہن ہی میں سب کچھ ہے جیسا کہ بعد میں جارج برکلے نے کائنات و افراد کو (God Mind) میں قرار دیا۔

آپ ذرا اِن دو کلمات پر غور کریں:

1. لا الہ الا اللہ .... اللہ کے سوا کوئی معبود (الہ) نہیں۔
2. لا موجود الا اللہ........... اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں۔

آپ غور فرمائیں صرف ایک لفظ کے بدلنے سے معنویت میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فاصلہ و فرق آ گیا ہے۔ پہلے کلمہ میں بھی نفی ہے اور وہ نفی کائنات کی ہر شے کو تسلیم کرتے ہوئے صرف ''الہ'' کی سطح پر ''غیر'' کی موجودگی کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ اب اگر کوئی شخص ''الہ'' کی سطح پر کسی بھی انسان، جن، فرشتے یا بت وغیرہ کو تصور کرتا ہے تو ''شرک'' ہے، الہ واحد کو قبول کرنا ''توحید'' ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ جبکہ دوسرے کلمے میں اللہ کے سوا کسی چیز یا شے کے موجود ہونے کی نفی ہے۔ اللہ کے سوا کچھ موجود ہی نہیں...... بظاہر جو کثرت نظر آتی ہے یہ دراصل ہمارا وہم وخیال ہے۔ اسے تسلیم کرنے کا مطلب ''شرک'' ہے یعنی جس طرح توحید کے مقابل کسی کو ''الہ'' تسلیم کرنا شرک ہے، اُسی طرح وحدت کے مقابل کثرت ماننا شرک ہے۔ کیونکہ وحدت کا تضاد دوئی یا ثنویت ہے۔

عقائد کی بنیاد ضعاف اور موضوعات پر کیوں......

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ابن عربی نے قرآن وحدیث سے وحدت الوجود کے اثبات میں جو کام لیا ہے، وہ واقعی درست نہیں۔ قرآن حکیم کی آیات کے ساتھ اُن کا انداز تفسیری کے بجائے تاویلی ہے اور خاص طور پر وہ جب ''اعتبار''[1] قائم کرتے ہیں تو صحت سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح روایات کا ضعف اُن کے اور احمد سرہندی دونوں کے یہاں نمایاں ہے۔ ہر دو نے نہ صرف ضعیف روایات سے استدلال

کیا ہے بلکہ موضوعات کو بھی اپنی ضرورت کے تحت استعمال کیا ہے، یہاں صرف ایک مشہور روایت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جسے وحدت الوجود کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

((كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَرَدْتُ اَنْ اَعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ .))

"میں ایک خزانہ پوشیدہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے خلق کو پیدا کیا۔"

یہ روایت جس پر تصوف کی بنیاد ہے، قطع نظر اس کے کہ کسی مستند مجموعہ حدیث میں موجود نہیں، بلکہ یقینی طور پر موضوع (جھوٹی) روایت ہے۔ علامہ سخاوی نے بھی "مقاصد الحسنہ" میں درج ذیل تحقیق کا ذکر کیا ہے:

"٨٣٨: حَدِيْثُ كُنْتُ كَنْزًا لَا اَعْرِفُ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اَعْرِفَ فَخَلَقْتُ خَلْقًا فَعَرَفْتُهُمْ بِيْ فَعَرَفُوْنِيْ ، قَالَ ابْنُ تَيْمِيَه؛ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ ﷺ ، وَلَا يُعْرَفُ لَهٗ سَنَدٌ صَحِيْحٌ وَلَا ضَعِيْفٌ وَتَبِعَهُ الزَّرْكَشِيُّ وَ شَيْخُنَا۔" ❶

روایاتِ موضوعہ کے بارے میں مشہور حنفی عالم ملا علی قاری نے اپنی ایک کتاب "موضوعات الکبیر" کے نام سے لکھی ۔وہ مندرجہ ذیل تحقیق بلفظہٖ ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"وَالْعَسْقَلَانِیُّ وَلٰكِنْ مَعْنَاهُ صَحِيْحٌ مُسْتَفَادٌ مِنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ اى لِيَعْرِفُوْنَ كَمَا فَسَّرَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما۔" ❷

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا محمد مسعود عالم قاسمی، اپنی کتاب "فتنۂ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان" صفحہ ۱۲۳ پر روایت مذکور (كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا) کے بارے میں لکھتے ہیں:

❶ المقاصد الحسنة للخاوی ص ٣٢٧ مطبوعه مصر تحت روايات حرف الكاف.

❷ موضوعات الكبير ص٢٣٧ ، روايت نمبر ٣٥٣ ، طبع بيروت .

''یہ روایت قطعی جعلی اور واہیات ہے، امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں اور نہ اس کی کوئی سند ہے۔ علامہ زرکشی اور حافظ ابن حجر نے اس کی تائید کی ہے۔''

روایت کی اسنادی حیثیت تو سرے سے موجود ہی نہیں لیکن اگر آپ اس کے معانی و مفاہیم پر غور کریں تو ایک طرف تو یہ قرآن حکیم کے واضح بیانات کے خلاف ہے اور دوسری طرف خود وحدت الوجود کی نفی کرتی ہے۔

یہ موضوع روایت تخلیق کو پہچان یا اللہ تعالیٰ کی اس ضرورت یا محتاجی کا بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اسے پہچانا جائے۔ ابن عربی کے شعر کا ترجمہ ہے:

① ......''پس ہر ایک واجب اور ممکن ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں، واجب ظہور کے لیے ممکن کا محتاج ہے اور ممکن وجود کے لیے واجب کا محتاج ہے...... یہ بات حق ہے جو ہم نے کہی ہے ہم اس کو پوشیدہ نہیں رکھتے۔

② ......اگر تو حق تعالیٰ کی بے نیازی کا ذکر کرے کہ اس کو کسی کی محتاجی نہیں تو بھی درست ہے، لیکن تحقیق تُو نے جان لیا جو کچھ اس قول سے ہماری مراد ہے۔''[1]

مندرجہ بالا ہر دو اشعار میں معنوی وفکری تضاد بھی دیکھ لیجیے کہ کس طرح اپنے بیان سے پھرنے کی کیفیت ہے! اگر تخلیق کا مقصد پہچان ہی کروانی ہے تو پھر بے نیازی کیسی؟ ابن عربی کی مجموعی فکر میں پہلا بیان ہی درست ہے کہ واجب اپنی پہچان کے لیے ممکن کا محتاج ہے۔

لیکن یہ تخلیق کا مقصد ہی نہیں، قرآن حکیم تو واضح اعلان کرتا ہے کہ

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾

''ہم نے جنوں اور انسان کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔''

---

[1] فصوص الحکم، مترجم: محمد ریاض قادری، ص٦٩.

دوسری جگہ فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴾ (الملك : ٦٧/ ٢)

''جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے؟ وہی عزت والا اور بخشنے والا ہے۔''

تخلیق کا مقصد عبادت ہے اور عبادت کے ذریعے اپنے بندوں کو نوازنا مقصود ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت یا محتاجی ہے۔ اگر تمام انسان بھی نافرمانی پر اُتر آئیں تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اسنادی حیثیت کی اس بے بنیاد روایت کو جب معنوی حوالے سے ہم دیکھتے ہیں تو واضح طور پر یہ وحدت الوجود کے خلاف پڑتی ہے۔ (فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ) ''میں نے مخلوق کو پیدا کیا'' حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کا یہ تصور وجود کی وحدت کو باطل کرتا ہے کیونکہ خالق ومخلوق کا رشتہ تو وحدت الوجود میں ممکن ہی نہیں، وہاں تو تخلیق کے بجائے عینیت کا رشتہ ہے کہ ''اللہ عین کائنات ہے'' باعتبار وجود کے وہ موجودات کا عین ہے۔ [1]

اِسی مفہوم میں ابن عربی نے کہا کہ ''اعیانِ ثابتہ نے خارج کی بو تک نہیں سونگھی'' مطلب ہے کہ کچھ بھی پیدا نہیں ہوا۔ اعیانِ ثابتہ (صورِ علمیہ) اللہ کے ذہن میں ہی ہیں اور وجود بصورتِ تنزلات، مختلف تعینات میں اپنا اظہار کر رہا ہے، اگر آپ وجود کے مقابل کچھ مانتے ہیں تو شرک ہے۔ جس سے وجود کی وحدت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا تخلیق کے عمل کا وحدت الوجود سے کوئی تعلق نہیں۔ توحید کے حوالے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور حیات وکائنات اس کی تخلیق ہے بلکہ عدم سے وجود میں لایا اور یہ ثنویت یا دوئی ہے، جس کے لیے وحدت الوجود میں کوئی جگہ نہیں کیونکہ ہمارے پاس اصول بھی یہی ہے کہ ''لا موجود الا اللہ، کلمہ لا الہ الا اللہ'' تو صرف 'الٰہ' کی سطح پر کسی بھی موجود کی نفی کرتے

---

[1] فصوص الحکم، مترجم مولانا برکت اللہ، ص۲۰۳.

ہوئے صرف اللہ کا اثبات کرنا ہے، 'الٰہ' کی سطح پر غیر اللہ کی اِس نفی سے حیات وکائنات کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ 'الٰہ' خود اس بات کا متقاضی ہے کہ حیات وکائنات اپنی تمام تر نفسی اور جسمانی کیفیات وضروریات میں اُس سے رجوع کرے۔ابن عربی لکھتے ہیں:

''اے طالبِ حق! ہم نے تم کو نصیحت کردی۔ اب مانگو تو بس اللہ سبحانہٗ سے مانگو۔''❶

وحدت الوجود کی دشواریاں کہیے یا نافہمی کہ انسانی ذہن کشمکش میں چلا جاتا ہے۔

وحدت الوجود کی دشواریاں خود اپنوں کی زبانی:

محمد ریاض قادری لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ اور عالم کا تعلق خالق ومخلوق کے علاوہ یہ ہے کہ عالم صورتِ حق کی تجلی عالم کے اعیانِ ثابتہ میں پیچ صورتوں کے ہے۔ عالم سایۂ حق ہے، جیسے شخص کا سایہ غیر شخص نہیں ہوتا۔'' یہی بات مولانا عبدالقدیر صدیقی کے ترجمہ میں ابنِ عربی کے اپنے الفاظ میں دیکھیے:

''مطلق عین مقید ہے، تحقیق ،وجود میں اور غیر ہے تعقل وفہم میں پس موجودات جس کو محدثات اور مخلوقات کہتے ہیں، وہ بھی اپنی ذات حقہ ومنشاء اصل کے لحاظ سے علی وبلند ہیں، کیونکہ موجودات اس لحاظ سے غیر حق نہیں۔ پس حق تعالیٰ بذاتِ علی ہے۔ باضافت علی نہیں، کیونکہ اعیانِ ثابتہ ومعلومات الٰہیہ جن کا وجود خارجی نہیں، ہنوز کتم عدم میں ہیں۔ ان کو وجودِ خارجی کی ہوا تک نہیں لگی، پس اعیانِ ثابتہ باوجود موجوداتِ خارجیہ ہیں متعدد معلوم ہونے کے ہنوز اپنے عدمِ اصلی پر ہیں اور وہ ذات جو مجموع صَوَر میں مخفی ہے، مجموع اور کثرت سے بحیثیت تقید ظاہر ہے اور مجموع اور کثرت میں بحیثیت اطلاق باطن ہے۔''❷

---

❶ فصوص الحکم، مترجم عبدالقدیر صدیقی، ص ۳٤۰.

❷ فصوص الحکم، مترجم: عبدالقدیر صدیقی، ص ۷۷.

بات وہی ہے جو تکرار پہلے بیان کی جا چکی ہے، یہ تکرار بلکہ ناگوار قسم کی تکرار فصوص الحکم کا انداز ہے کیونکہ بات صرف اتنی ہے کہ اللہ عین کائنات ہے، اعیانِ ثابتہ یا صُورِ علمیہ، تجلّی کے بعد موجوداتِ خارجیہ ہو کر بھی ہنوز کتم عدم یا ذات کے بطون میں ہیں یعنی اُنھیں خارج کی ہوا تک نہیں لگی، کچھ تخلیق نہیں ہوا۔

غرض وحدت الوجود میں تخلیق کا اثبات کریں تو وحدت الوجود ختم ہوتی ہے، کیونکہ ماسوا اللہ کوئی موجود ہی نہیں ۔لہٰذا خالق و مخلوق، عبد و رب ایسے الفاظ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اعتباری ہیں۔ تاہم پھر اس سے یہ سوال تو سامنے آتا ہے کہ الفاظ کو ان تعلقات میں استعمال کرنا کیوں ضروری یا مجبوری ہے؟ کیونکہ یہ تو فلسفۂ وجودِ واحد کی نفی کرتے ہیں۔

محمد ریاض قادری وضاحت کرتے ہیں:

> ''اُن (ابنِ عربی) کی نظر میں خلق ایسی چیز ایجاد کرنے کے معنی میں نہیں ہے، جس کا کوئی وجود نہ ہو بلکہ یہ عقلاً اور عملاً بھی محال ہے اور نہ ہی خلق اس فعل کا نام ہے جو خدا نے زمانہ ماضی میں ایک بار پیدا کر دی ہو اور پھر تخلیق سے الگ ہو گیا ہو، بلکہ خلق کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے ایک ازلی اور دائمی حرکت ہے جو وجود کو ہر آن ہر نئے لباس میں نمایاں کرتی ہے اور اس سے وجودِ واحد پر لامتناہی صورتیں لگاتار وارد ہوتی ہیں جن سے وجود میں کوئی کمی آتی ہے نہ نقصان ہوتا ہے...... لہٰذا وجود کے بحرِ بے کراں میں ہر وقت ایک طلاطم ہے، جس سے موجودات، حباب و امواج کی طرح ہر لحظہ نئی نئی صورتیں ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔'' [1]

بقول مرزا غالب:

ہے مشتمل نمود صوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

[1] فصوص الحکم، ص٦٩، ٣٤٨.

شیخ سرہندی اور مقامِ ظلّیت:

مندرجہ بالا بیان میں خالق ومخلوق کے تعلق پر جلدی سے گزر جانے والی کیفیت آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کیونکہ یہ تعلق ہے بھی نہیں۔ پھر حق تعالیٰ کی اگر روح عالم ہے تو پھر عالم تو بمنزلہ جسم کے ہوا اور اگر ''عالم سایۂ حق'' ہے تو بھی وحدت الوجود باطل ہوئی کہ سایہ بالوجود، موجود ہے اور وجود سے الگ ہے اور یہ غلط ہے کہ وہ غیر شخص نہیں بلکہ شخص کا غیر یا اضافی ہے اور کیفی سطح پر موجود ہے (احمد سرہندی کے یہاں یہ مقامِ ظلیت کا ہے) عالم حق وخلق میں تقسیم کیسے ہوا؟ بلکہ عالم تو تعینِ وجود ہے اور یہ کہہ کر تخلیق کی نفی کر دی کہ عالمِ حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ظہور ہے، کیونکہ ''مرتبہ احدیت سے ذات نے تنزل فرما کر مرتبۂ وحدت میں ظہور فرمایا جو نورِ محمدی ﷺ ہے، اس مرتبہ میں اسماء وصفات کا ظہور اجمالی ہے۔''[1]

حقیقت محمدیہ کی حقیقت:

یہ بات بذاتِ خود مخمصہ والی ہے کہ دوسرے تنزل میں اللہ تعالیٰ کس طرح نورِ محمدی ﷺ بن گیا؟ (اللہ کا یہ تنزل ثانی، حقیقت محمدیہ ہے یعنی اللہ، محمد ﷺ کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اگر محمد ﷺ کی صورت میں بھی اللہ ہی ہے تو پھر یار لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ اللہ کا اثبات کرتے ہوئے محمد ﷺ کی نفی کر رہے ہیں۔ اللہ خالق ہے اور محمد ﷺ مخلوق اور مخلوق میں شاہکارِ اعظم، اب اگر ہم اللہ کو محمد ﷺ میں براجمان مانتے ہیں تو محمد ﷺ کی انفرادیت اور موجودگی کی نفی کرتے ہیں۔ ذاتِ محمد ﷺ کی یہ نفی ہر دو یعنی اللہ کی محبت میں یا نبی ﷺ کی محبت میں درست نہیں۔ اِسی طرح لا الہ الا اللہ کے تقاضوں کو پہلے پورا کرنا اور بعد میں محمد ﷺ تک رسائی کی بات کرنا جیسا سرمد کے واقعہ میں بیان کی جاتی ہے، غلط ہے۔ بلاشبہ توحید اول ہے مگر راستہ صرف اور صرف اطاعتِ مصطفےٰ ہے۔ ہر دو لازم وملزوم ہیں۔) یہاں اگر اُس ضعیف روایت کا سہارا بھی لیں جس میں کہا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا'' تو بھی تخلیق کا اثبات ہوتا ہے نہ کہ تنزل اور نتیجہ کے طور پر

[1] ایضاً، ص ۶۰۔

تعین ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلق کا کوئی حسّی یا مادی وجود نہیں بلکہ وہ معقول ہے ۔ ملاحظہ ہو فصوص الحکم کے شارح محمد ریاض قادری لکھتے ہیں:

''علماءِ حق یعنی صوفیائے کرام کی تحقیق و مشاہدہ کے مطابق حق محسوس و مشہود ہے اور خلق معقول ہے برعکس علماءِ ظاہر کے کہ خلق محسوس و مشہود ہے اور حق معقول (مخفی) ہے۔ چونکہ ازرائے حقیقت وجود حق تعالیٰ کے لیے ہے، پس جو کچھ عالم حس و شہادت میں ہے وہ وجود حق تعالیٰ ہے۔ خلق اس وجودِ حقیقی کے ظہور کا نام ہے۔ پس موجود تو پھر حق تعالیٰ ہوا جو فی نفسہٖ موجود ہے اور اپنے وجود کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں اور خلق اپنے وجود کے لیے حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ یعنی اس کا وجود حقیقی نہیں صرف عقلاً (معقول) ثابت کیا جاسکتا ہے۔ براہِ راست جو موجود ہے وہ حق تعالیٰ ہے۔ اس کا وجود بلاواسطہ براہِ راست موجود ہے اور خلق بالواسطہ موجود ہے، پس معقول ہے، محسوس و مشہود نہیں یعنی اس کے وجود کا حسی اور شہودی ثبوت نہیں ہے۔'' [1]

خلق، معقول ہے تو پھر بات وہی ہے کہ اعیانِ ثابتہ نے خارج کی بوتک نہیں سونگھی......

وحدت الوجود کے تضادات:

فلسفۂ وحدت الوجود، کلامی انداز میں ذات اور کائنات کی عقلی و نقلی تعبیر میں کس قدر الجھاؤ کا شکار ہے؟ اس کا اندازہ گزشتہ صفحات سے لگایا جاسکتا ہے مگر یہاں ہم چند ایسی وجوہات کا ذکر کرتے ہیں جو اس فلسفہ یا علم کلام کے بنیادی تقاضات ہیں۔

◆...... وحدت الوجود میں پہلے تین مراتب یعنی احدیت، وحدت اور وحدانیت، ذات کے داخلی تنزلات ہیں ،اگر بقول ابنِ عربی صفات عین ذات ہیں اور اسم مسمّٰی کا عین ہے نیز ذات، صفات قدیم ہیں تو پھر احدیت کا مرتبہ کیونکر ممکن ہے جو لاتعین، اسماء صفات سے مُبرّا، منزہ ہے ،اشارہ وکنایہ کو بھی قبول نہیں کرتا، یہ بے رنگ مرتبہ احدیت کو محض

[1] ایضاً، ص۵۲.

''ہونے'' تک محدود کرتا ہے اور ایسا 'ہونا' بھی کیسا 'ہونا' ہے۔ جہاں ہر اطلاق کی نفی ہو۔ جہاں تک اس آیت سے کہ: ﴿إِنَّ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهُ ......﴾: اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی'' سے مرتبہ اخذ کرنے کا تعلق ہے۔ تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ذات اپنی تمام تر صفات کے ساتھ قدیم ہے اور وحدت الوجود کا بھی یہ ماننا ہے۔''اعیانِ ثابتہ علمِ الٰہی ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ کے ساتھ قدیم ہیں اور تحتِ کن اور مخلوق نہیں'' (فصوص الحکم، مترجم عبدالقدیر صدیقی، ص ۱۷۸) تو پھر اس سے بے رنگ د بے صفات، احدیت اخذ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس مقام پر یہ تاویل کیسے ہوسکتی ہے...... ''مرتبہ احدیت میں ہم جو تنزیہ ہمارے علم وادراک کی جہت سے ہے، اس جہت سے نہیں کہ ذاتِ مطلق خود اپنے کمالاتِ ذاتی اور اُن کے علم و ادراک سے معرّیٰ (خالی) یا منزہ تھی۔''[1]

وحدت الوجود، فلسفہ اور عقیدہ توحید:

مگر جیسا کہ دوسرے دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ مستوی العرش ہے۔اس کا عرش پانی پر تھا۔ اسی طرح وحدت پر اجمالی صفات کا ظہور بھی غیر منطقی ہے۔وجود میں ارتقا نہیں، یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ابنِ عربی نے فلسفہ ومنطق کے مسائل چھیڑے ہیں، مذہب کے حوالہ سے اسے علم کلام کا رنگ دیا ہے، مگر انھوں نے کہیں بھی اپنے پیش رودں خواہ فلسفی ہوں، خواہ کلامی، کسی کا حوالہ نہیں دیا، مذہبی افراد عام طور پر چونکہ فلسفہ ومنطق کی طرف متوجہ نہیں، اس لیے اس کلامی بحث کو مذہبی خیال کرتے ہیں جو یقیناً غلط ہے،''احدیت'' کے حوالے ہی سے۔''روایاتِ فلسفہ'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> ''افلاطون ذاتِ احد کو اس کائنات سے اس قدر بے تعلق اور ماوراء سمجھتا تھا کہ اس کے لیے''ایک'' کا لفظ استعمال کرنا نامناسب خیال کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک کا تصور کثرت کے تصور کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، یعنی صرف ''ایک کہہ دینے سے کثرت لازم آجاتی ہے۔فلاطینوس نے اس عقیدے کو عقلی

[1] فصوص الحکم، مترجم: محمد ریاض قادری، ص ۹۰.

استدلال سے حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عقیدہ مان لیا کہ ذاتِ باری ایک ہے اور کثرت سے ماوراء ہے۔ اس سوال نے اسے پریشان نہیں کیا کہ "ایک" کثرت سے ماوراء کیونکر ہوسکتا ہے اور اگر وہ کثرت سے ماوراء ہو تو کثرت اس سے متفرع کیسے ہوگی؟ جب ذاتِ احد اور کائنات کے درمیان کسی نوع کا تعلق نہیں تو وہ کائنات تخلیق کیسے کر سکے گا؟ اس دقت کو عقلاً رفع کرنے کے بجائے فلاطینوس نے شعراء اور صوفیہ کی طرح استعاروں سے کام لیا اور کہا کہ کائنات ذاتِ باری سے ایسے متفرع ہوئی جیسے آفتاب سے شعاعیں یا جیسے برف سے سردی یا جیسے مکڑی سے جالا وغیرہ۔" [1]

کیونکہ صفات قدیم ہیں اور اُن میں تدریج و ارتقا نہیں ،ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کچھ تو قدیم ہوں اور کچھ حادث، مخلوق کے تعلق سے حدوث، صفات کو قِدم سے باہر نہیں کرنا کیونکہ خالق نہیں مخلوق حادث ہے۔ غرض احدیت، وحدت اور واحدیت کا یہ ارتقا یا تنزلات محض قیاس ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں اِس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس طرح ارتقا تنزلی غلط ہے، اُسی طرح ارتقا صعودی بھی غلط ہے۔ کیونکہ ذات اکمل ترین درجہ پر ہے جس سے ماورا کوئی درجۂ کمال موجود نہیں لہٰذا مزید استکمال کا تصورِ ذات میں نقص سے عبارت ہوگا۔

۲ ...... حیات وکائنات، اگر وجود کے تنزلات ہیں اور حیات و کائنات میں اسما و صفات کا ظہور ہے۔ بقولِ ابنِ عربی:

"پس تو حق تعالیٰ کی طرف نظر نہ کر جس حال میں تو حق تعالیٰ کو خلق سے جدا جانتا ہے یعنی حق کو خلق سے جدامت جان بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تنزل فرما کر خلق کی صورت پر جلوہ گر ہے۔" (ص ۱۳۸)

تو پھر خلق کو وہمی تصور کرنے کا کوئی جواز نہیں، اگر یہ کہا جائے کہ خلق ایک جہت سے

---

[1] روایاتِ فلسفہ، علی عباس جلال پوری، ص ۸۷۔

حق اور دوسری جہت سے خلق ہے تب بھی خلق کا وجود مرتبۂ وہم میں متصور نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ حق کا ظہور ہے اور ظہور باطل یا وہم ہوتو پھر لاشے کا تو وجود نہیں ہوسکتا، لہٰذا لازم ہے کہ وحدت وجود کی رُو سے بھی خلق کو مرتبہ ناسوت میں خارج میں تسلیم کیا جائے۔

> "محقق عارف کثرت، وحدت میں دیکھتا ہے، یعنی وہ اس راز کو پالیتا ہے کہ کثرتِ عالم ذاتِ واحد کا ظہور ہے...... یا جیسا کہ وہ اس راز کو جانتا ہے کہ اسماء الٰہیہ کا مدلول ذاتِ واحدہ ہے کیونکہ ان کے حقائق اگرچہ مختلف ہیں اور بہت ہیں مگر ان کا عین ایک ہی ہے۔ پس یہ کثرت ذات واحدہ میں عقلی چیز ہے، یعنی یہ کثرت شہودی جو نظر آرہی ہے، ایک عقلی چیز ہے۔ اس کا خارج میں اور حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔" (ص۲۰۴)

مندرجہ بالا بیان کا تضاد، کہ کثرتِ عالم ذات واحد کا ظہور اور کثرتِ شہودی کا خارج میں وجود نہ ہونا، وحدت الوجود کا خاصا ہے، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ وجود مرتبہ ناسوت میں آئے اور پھر اس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہ ہو جبکہ خلق کا وجود بھی ذات کا وجود ہے؟ چنانچہ کہتے ہیں:

> "......موجودات بھی معلوماتِ حق ہی ہیں پس موجودات کی حقیقت کیا ہوئی معلومات حق ہی کا نام موجودات ہوا، لہٰذا وہ ذاتِ عالم ہے وہی ذاتِ معلوم ہے اور وہی ذاتِ عین علم ہے اگرچہ موجودات خارجیہ باہم ایک دوسرے کی غیر نظر آتی ہیں اور خدا کی بھی غیر نظر آتی ہیں مگر یہ غیریت محض اعتبار اور نسبتی ہے، حقیقی نہیں ہے۔ حقیقت میں وجود واحد کی یہ نمود (ظہور) ہے جو انگنت صورتوں میں نمایاں ہے......"[1]

جودی لاجواب ہوگئے:

غرض یہ کہ حیات وکائنات کو ظہور ونمودِ ذات کہیں تو وہمی نہ کہیں اور اگر وہمی ہے تو

[1] فصوص الحکم، ص۱۸۲.

پھر ظہورِ ذات کیسا؟ پھر تنزلات اور نتیجہ کے طور پر تعینات کیسے؟ اور

؎ گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی، کیوں؟

پھر یہ بات بذاتِ خود انسانی فہم سے بالا ہے کہ وجود تنزلات ستہ فرماتا ہے تو پھر یہ تو تقسیم کا عمل ہوگا کہ وجود چھ حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وجود تنزل بھی فرمائے اور اُس میں کسی طرح کی کمی واقع نہ ہو، تخلیق میں تو کہا جاسکتا ہے کہ خالق نے مخلوق پیدا کی، مگر وجود کا اپنا تنزل، کثرت میں ڈھلنے سے وہاں اور یہاں ایک سا نہیں رہ سکتا، یہ محال ہے۔ لہٰذا وحدت الوجود، اللہ عین کائنات ہے۔ اسی صورت میں درست ہوگی جب تنزلاتِ ستہ سے جان چھڑا لے، اگر یہ کہا جائے کہ اعیانِ ثابتہ پر تجلّی سے وہ خارج میں موجود ہوگئے تو خارج میں تو کچھ موجود ہیں، اعیانِ ثابتہ نے خارج کی بو تک نہیں سونگھی، وہمی نوعیت بھی اسی لیے کہی گئی، لہٰذا وحدت الوجود کے حوالے سے صرف وجود (اللہ) موجود ہے، مقابل عدم ہے بلکہ عدم بھی نہیں کہ یہ بھی خیال یا وہمی سطح کے حوالہ سے وجود کا حامل ہوا۔ وہم شے، شے ہی ہے گو کہ وجودِ مادی سے منزہ و ماورا ہے۔

ابنِ عربی اس بات کا تو بار بار ذکر کرتے ہیں کہ اعیانِ ثابتہ پر تجلّی اُن کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے، نیک و بد، سعید و شقی یا طاقتور و کمزور تجلّی کو حسبِ استعداد و کیفیت طلب کرتے ہیں، مگر وہ اس بات کا واضح جواب نہیں دیتے کہ ان میں یہ استعداد آئی کہاں سے؟ جب کہ اس بات میں کوئی اشکال نہیں کہ اعیانِ ثابتہ یا معلوماتِ حق، اللہ کی اپنی معلومات ہیں تو پھر گویا موجودات تو بنے بنائے ہیں، ان میں فرق و تفریق خلقی ہے اور یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ تجلّی کو حسبِ استعداد طلب کرتے ہیں یا علم تابع معلوم ہے جبکہ علم والے نے اپنے علم کو پہلے ہی متعین کردیا ہے، لہٰذا اختیار کا پہلو محض ایک خیال ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بقول میر تقی میر: ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہئیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

تضاد بیانی اور ٹامک ٹوئیاں:

اور اگر وہ اپنی نفسی ❶ کیفیت کے تابع ہیں جو کہ تخلیق سے قبل دراصل غلط تصور ہے، تب بھی جبر کا پہلو ہی غالب ہے، قدر کا کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح خیر وشر کا تصور بھی وحدت الوجود میں ممکن نہیں، وجود واحد ہے، مقابل عدم ہے تو پھر کیا وجود کا ایک حصہ خیر اور دوسرا شر پر مشتمل ہے(نعوذ باللہ)؟ شر کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے اور دین میں بھی واضح طور پر جنت اور جہنم کا تصور دیا گیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ افراد کو کسی وحدت میں شناخت کرنے کے بجائے اُن کے لیے ثنویت یا دوئی کا کوئی تصور قائم کیا جائے۔ ابنِ عربی یہاں اسماء وصفات کا سہارا لیتے ہیں اور چونکہ اعیانِ ثابتہ پر تجلی اُن کی استعداد اور طلب کے مطابق پڑتی ہے لہٰذا .... ''مجرمین اسم مضِل کے مظہر تھے۔ ان کے اعیانِ ثابتہ نے علمِ الٰہی میں زبان استحقاق سے سوال کیا کہ ہم جہنم کے لائق ہیں، ہمیں جہنم پہنچایئے۔ اس لیے وہ اپنے کمالِ مقصود یعنی جہنم سے واصل ہوگئے، چونکہ ان کی پیشانیاں ان کے رب نے پکڑ رکھی تھیں اس لیے وہ اپنی ذاتوں کے ساتھ اس راہ پر نہیں چلے بلکہ وہ اس راہ پر جبراً چلائے گئے حتیٰ کہ وقتِ موت آ گیا۔ یہاں تک کہ وہ عین قرب میں پہنچ گئے ...... قرب میں سعید و شقی کی کوئی خصوصیت نہیں، میت خواہ سعید ہو یا شقی، دونوں ہی رازِ حقیقت کو پالیتے ہیں۔'' ❷

جبکہ:

> ''دنیا میں یہ لوگ خیال کرتے تھے کہ عالمِ غیرحق اور عبد غیرحق ہے اور دوزخ قربِ حق سے دوری کا نام ہے۔ جب موت کے بعد رب نے اُن کو مقامِ جہنم کی طرف چلایا تو وہ عین قرب میں واصل ہوئے اور دوری زائل ہوگئی اور اُن پر یہ منکشف ہوگیا کہ غیرحق کا وجود ہی نہیں۔ جہنم جو بظاہر بُعد کا مقام ہے، حقیقتاً اُن کے لیے عین قرب ثابت ہوا اور وہ رازِ توحید کو پا گئے۔'' ❸

---

❶ خواہشِ نفس کو الٰہ بنانا تخلیق کے بعد عبد کا کام ہے۔

❷ فصوص الحکم، ص١٦٩ ۔ ❸ فصوص الحکم، ص١٦٨ ۔

یہ وحدت الوجود کا منطقی نتیجہ ہے کیونکہ وجودِ واحد (اللہ) میں شر کا اثبات کیسے کیا جاسکتا ہے؟ تاہم ابنِ عربی کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ پہلے بندہ کا طلبِ استعداد کے حوالے سے قدر یا اختیار تسلیم کر چکے ہیں، لیکن یہاں وہ جبرِ محض کی بات کرتے ہیں اور وحدت الوجود کے حوالے سے تو جبر و قدر کی بحث ہی لایعنی ہے کیونکہ دوسرا کوئی موجود ہی نہیں جسے احاطۂ جبر میں لایا جائے یا شر سے منسوب کیا جائے۔

تاہم چونکہ وحدت الوجود، خیر و شر، جبر و قدر کی تشریح نہیں کرسکتی اور دوسری طرف اسلام کے تصورات نہایت واضح ہیں۔ لہٰذا ابنِ عربی تردّد کا شکار رہتے ہیں اور نفی و اثبات کے دریا میں سرگرداں ہیں۔ مولانا عبدالقدیر صدیقی کے ترجمہ فصوص الحکم کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اُن کو آخرت میں اُن کی فطرت کے مطابق دائرۂ جہنم میں دوغم پہنچیں گے۔ حالانکہ ان اہلِ علم کو یقین ہے جن کو حقائق واحوال و اقتضادات کا کشف صحیح ہے کہ دارِ آخرت میں اُن کے لیے نعمتِ خاص بھی ہے کیونکہ بیت الخلا کے کیڑوں کو بیت الخلا ہی میں رہنا ضرور ہے، وہ گلاب کی خوشبو سے مرجاتے ہیں۔'' [1]

جب اہلِ دوزخ بیت الخلا کے کیڑوں کی طرح آگ سے راحت حاصل کریں گے تو پھر عقوبت وسزا کے تمام تصورات باطل ٹھہرے اور یہی وحدت الوجود کا منطقی نتیجہ ہے کیونکہ اللہ اپنے ہی وجود کو عذاب دے؟

وحدت الوجود میں اخلاقیات کی کوئی جگہ نہیں ۔ یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو وحدت الوجود کی مکمل تشریح کرتا ہے مگر یہ ایسے شعبہ سے متعلق ہے جہاں عام طور پر اہلِ قلم جانے سے گریز کرتے ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی کی سوانح ''تذکرۃ الرشید'' سے ارشاد اللہ مان نے اپنی کتاب ''حق کی تلاش'' ص نمبر ۲۷۵ میں لکھتے ہیں:

---

[1] فصوص الحکم، ص۱۸۲.

اخلاق باختہ قصہ بھی سنیے:

''نظریۂ وحدت الوجود میں ڈوبا ہوا ایک قصہ پڑھیے جو تذکرہ الرشید میں پیر جیو محمد جعفر صاحب ساڑھوری بیان کرتے ہیں:

''ایک روز مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدہ نے دریافت کیا کہ یہ حافظ مینڈھو شیخ پوری کیسے شخص تھے؟ آپ نے فرمایا: ''پکا کافر تھا اور اس کے بعد مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ ضامن علی جلال آبادی تو توحید میں غرق تھے، ایک بار ارشاد فرمایا، ضامن علی جلال آبادی کی سہارن پور میں بہت سی رنڈیاں مرید تھیں، ایک بار یہ سہارن پور میں کسی رنڈی کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ سب مریدنیاں اپنے میاں صاحب کی زیارت کے لیے حاضر ہوئیں مگر ایک رنڈی نہیں آئی۔ میاں صاحب بولے کہ'' فلانی کیوں نہیں آئی؟'' رنڈیوں نے جواب دیا:'' میاں صاحب ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ چل میاں صاحب کی زیارت کو تو اس نے کہا میں بہت گنہگار ہوں اور بہت روسیاہ ہوں، میاں صاحب کو کیا منہ دکھاؤں، میں زیارت کے قابل نہیں۔'' میاں صاحب نے کہا:'' نہیں جی! تم اسے ہمارے پاس ضرور لانا۔'' چنانچہ رنڈیاں اسے لے کر آئیں۔ جب وہ سامنے آئی تو میاں صاحب نے پوچھا:'' بی! تم کیوں نہیں آئی تھیں؟'' اس نے کہا کہ جناب روسیاہی کی وجہ سے زیارت کو آتے ہوئے شرماتی تھی۔ میاں صاحب بولے:'' بی! تم کیوں شرماتی ہو؟ کرنے والا کون ہے اور کروانے والا کون؟ وہ تو وہی ہے۔'' رنڈی یہ سن کر آگ بگولا ہوگئی اور خفا ہوکر کہا: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ، اگرچہ میں روسیاہ، گنہگار ہوں مگر ایسے پیر کے منہ پر پیشاب بھی نہیں کرتی۔'' میاں صاحب تو شرمندہ ہوکر سرنگوں رہ گئے اور وہ اٹھ کر چل دی۔''[1]

[1] تذکرۃ الرشید: ۲/۲۴۲۔

خود مولانا رشید احمد گنگوہی کا ایک مکتوب ''مکتوباتِ رشیدیہ'' میں سے مولانا محمد زکریا سہارن پوری نے نقل کیا ہے، وحدت الوجود کی ترجمانی کرتا ہے۔ آخری الفاظ ہیں'' یا اللہ! معاف فرمانا کہ حضرت کے ارشاد سے تحریر ہوا ہے، جھوٹا ہوں کچھ نہیں ہوں، ترا ہی ظل ہے، تیرا ہی وجود ہے۔ میں کیا ہوں، کچھ نہیں ہوں، اور وہ جو میں ہے وہ تُو ہے اور میں اور تُو خود شرک در شرک ہے، استغفر اللہ، استغفر اللہ! استغفر اللہ، لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔ اب عرض سے معذور فرما کر قبول فرمائیں۔ والسلام ۱۳۰۶ھ [1]

بقول مرزا غالب:

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں
ہم سمجھے ہوئے اس کو ہیں جس بھیس میں جو آئے

سب فرق ختم ہوگئے؟

ابنِ عربی لکھتے ہیں:

''......پس جب عارف منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے اور اس کو عرفان نصیب ہوتا ہے تو متحیر ہو جاتا ہے۔ جب سالک ذرّے ذرّے میں پتے پتے میں، ہر شے میں، ہر تعین میں، ہر نیک و بد، مسلم و غیر مسلم میں ذاتِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے بلکہ وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ ولاسواہٗ تو متحیر ہو جاتا ہے......'' [2]

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب نیک و بد، مسلم و غیر مسلم میں وہی ہے بلکہ ہر تعین میں وہی ہے تو پھر اہلِ جہنم بیت الخلا کے کیڑے کیوں؟ حقیقت یہ ہے اور نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ بیت الخلا کے کیڑے بھی تو اُسی کا ایک تعین ہے، نعوذ باللہ، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وجودِ واحد کے علاوہ بھی کچھ موجود ہے۔ وہ تو وہی ہے۔

بقول میر درد:

---

[1] امداد السلوک اُردو ادارہ اسلامیات، لاہور، (فضائل صدقات، ص ۱۹۸، کتب خانہ فیضی، لاہور۔

[2] فصوص الحکم، ص ۹۷، ترجمہ محمد ریاض قادری

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

"لہٰذا عارف وہ ہے جو وحدۃ الوجود کا قائل ہے اور ہر ہر صورت میں اُس بے صورت کو دیکھتا ہے......" ❶

❸ ...... وحدت الوجود کا منطقی نتیجہ وحدت ادیان ہے۔ چنانچہ کفر و اسلام کی تفریق بے معنی ہے۔ تمام افراد راہِ راست پر ہیں کیونکہ غیر موجود ہی کہاں ہے؟ وہ تو ہی ہیں چنانچہ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ دیوی دیوتا یا بتوں کے پجاری، تخیل الوہیت الہٖ واحد کی پوجا کرتے ہیں اور وجودی تفکر میں یہ درست بھی ہے کیونکہ بقول ابنِ عربی:

"پس تم لوگوں کے مرتبہ کو اللہ کے علم میں دیکھو اور بعینہٖ یہی مرتبہ قیامت کے دن خدا کے دیدار میں ہوگا۔ پس تم اس کو کسی خاص عقیدہ کی قید میں مقیّد کرنے سے بچو کہ تم کسی ایک مخصوص عقیدہ کی قید میں مقیّد نہ ہو جاؤ اور یہ کہ اس کے سوا باقی جملہ عقائد کی تکفیر کر بیٹھو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم سے خیر کثیر فوت ہوجائے گا بلکہ تم سے وہ علم باللہ جو نفس الامر میں چاہیے فوت ہوجائے گا......" ❷

بقول خواجہ میر درد:

مدرسہ تھا، دیر تھا، کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

گویا تمام راستے نبی ﷺ کے نقشہ کے برعکس اُسی (اللہ) کی جانب جارہے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی تخصیص درست نہیں مگر انسانوں میں پھر تفریق بھی کرتے ہیں اور کچھ کو اسم ہادی اور کچھ کو اسمِ مضل کی تجلی سے بہرہ مند کرتے ہیں، تاہم یہ اسم مضل کی تجلی والے۔ چونکہ صفت مضل کا پرتو لیے ہیں لہٰذا ان کے لیے جہنم تیار ہے لیکن کیسی جہنم؟

---

❶ فصوص الحکم، ص۹٦، محمد ریاض قادری۔

❷ فصوص الحکم، ص۱۷۸، محمد ریاض قادری۔

ابنِ عربی کہتے ہیں:

''مشرکوں کو اس لیے نار میں ڈالا جائے گا کہ ان کے قلوب سے وہم غیریت جل جائے، جب وہم غیریت جل جائے گا تو وہی نار اُن کو راحت نظر آئے گی اور وہ لذت حاصل کریں گے اور یہی نار اُن کے لیے گلزار اور نعیم ہوگی۔'' ❶

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''جب حق تعالیٰ ہی عالم کی ہویت ہے تو غاصب بھی خود ہے، مغضوب علیہ بھی خود، راضی بھی خود ہے۔ مرضی عنہ بھی خود، اہل نار بھی خود ہے، اہلِ جنت بھی خود۔'' ❷

منطقی نتیجہ:

یہی وحدت الوجود کا منطقی نتیجہ ہے کیونکہ جنت دوزخ بھی وجود کے تنزلات ہیں، تاہم پھر اس ''وہمِ غیریت'' کی کیا توجیہہ ہوگی ''جبکہ غیر اللہ کوئی نہیں'' ❸ شیطان، حقیقت سے بُعد یا دوری ہے۔ ❹ ''وہ موجود محض ہے اُس کے مقابل عدم ہے'' ❺

تو پھر ''غیر'' کیسا؟ وہمی غیر بھی ممکن نہیں اس لیے کہ وہم ہمیشہ موجود ہی کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ وہمی شے خیال میں اُسی وقت متحقق ہوتی ہے جب کہ اس کا کیفی یا کمیتی وجود نقش یا خارج میں پایا جائے۔ بیماریاں ہیں تو اُن کا وہم بھی ہے، جن ہیں تو اُن کا وہم بھی ہے۔ مگر جب وجود کے مقابل عدم ہے تو پھر ''غیر'' کا جو تصور بھی بنے گا، وہ وجودی فکر کے برعکس توحیدی فکر میں بنے گا۔ کیونکہ وجود کے مقابل تو عدم ہے مگر ''الٰہ'' کے مقابل لوگوں نے بہت سے ''الٰہ'' بنا رکھے ہیں اور قرآن وحدیث میں انھیں ''الہوں'' کی تکفیر کی گئی ہے۔ چنانچہ نیک وبد، اچھا یا بُرا، ادنیٰ و اعلیٰ، اچھا یا گندہ جو کچھ بھی ہے، وہ وجودِ واحد کی ہی

❶ فصوص الحکم، مترجم محمد ریاض قادری، ص ۲۷۲.
❷ ایضاً، ص ۲۷۸.
❸ فصوص الحکم [صدیقی]، ص ۳۳۵.
❹ فصوص الحکم [قادری]، ص ۲۷۹.
❺ فصوص الحکم [صدیقی]، ص ۲۰۲.

صورتیں ہیں، غیر کا کوئی وجود نہیں، لہٰذا یہ کیسے درست ہے کہ بقول مرزا غالب:

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جبکہ بقول ابنِ عربی:

''پس حق تعالیٰ ہی مختلف صورتوں میں تجلی فرماتا ہے اور دونوں صورتوں میں کوئی اُس کا غیر نہیں۔'' [1]

وجودی تاویلی انداز:

وحدت الوجود پر گفتگو بہت ہوگئی تاہم مزید دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

(ا)...... قرآنی آیات کا استعمال فصوص الحکم میں نہایت ہی تاویلی انداز میں ہوا ہے۔ ابنِ عربی تفسیر بھی اکثر درست نہیں کرتے اور اعتبار (اپنی مرضی پر آیات کے مفاہیم کو لینا) تو سرے سے گمراہی ہے، اِسی نہج پر بعد میں لوگوں نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو تفسیری کے بجائے تاویلی انداز ہے اور اِسے محض فلسفہ تک رکھا جاتا تو اور بات تھی، اس کے کلامی انداز سے قرآن وحدیث کے مفاہیم بدلنے کی سعی کی گئی ہے۔ مثلاً ابنِ عربی لکھتے ہیں:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾: اے محمد! جب تم نے بظاہر پھینکا تو حقیقت میں نہیں پھینکا بلکہ اللہ ہی نے پھینکا۔ آنکھوں نے تو صورتِ محمدی ہی کو دیکھا۔ جس کے لیے حسِ ظاہر میں رمی یعنی پھینکنا ثابت ہے۔ اسی صورت سے اللہ تعالیٰ نے نفی رمی بھی کی ہے یعنی حضرت نے بالذات نہیں پھینکا، وَمَا رَمَيْتَ پھر اُسی صورت محمدی کے لیے رمی ثابت کی گئی باعتبار توسط اور واسطہ ہونے کے ''اذ رمیت'' پھر بالذات پھینکنے والے کو صاف طور پر بیان کیا کہ وہ اللہ ہے۔ ولکن اللہ رمیٰ مگر صورتِ محمدی میں اس پر ایمان لانا ضروری

[1] فصوص الحکم [قادری] ص ۳۰۰.

ہے کیوں کہ یہ قرآنی آیت ہے۔ اس شانِ تاثیر ومؤثر کو دیکھو کہ حق صورت محمدی میں نزول فرماتا ہے......"❶

قطع نظر اس کے کہ محمد ﷺ کی صورت میں اللہ موجود تھا کہ نہیں؟ آپ صرف پوری آیت پڑھ لیں پھر دیکھیں کہ اس آیت میں سے پہلا حصہ عام طور پر کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے یا چھپا دیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ❷

"تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا اور آپ نے وہ خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے وہ پھینکی اور تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے اُن کی محنت کا خوب صلہ دیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔"

کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن کے حاشیہ میں مفسر سید محمد نعیم الدین مراد آبادی لکھتے ہیں:

"شانِ نزول جب مسلمان جنگِ بدر سے واپس ہوئے تو اُن میں سے ایک کہتا تھا کہ میں نے فلاں کو قتل کیا، دوسرا کہتا تھا میں نے فلاں کو قتل کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس قتل کو تم اپنے زور وقوت کی طرف نسبت نہ کرو کہ یہ درحقیقت اللہ کی امداد اور اس کی تقویت وتائید ہے۔❸

مکمل آیت آپ نے پڑھی، پہلے ذکر ہے کہ مشرکوں اور کافروں کو قتل اے مسلمانو! تم نے نہیں کیا، اللہ نے کیا۔ فعل کی نسبت اُسی طرح سے اللہ کی جانب ہے جیسے رمی میں ہے، لہٰذا ابنِ عربی کے مطابق تو اللہ تمام مسلمانوں کی صورت میں تھا صرف محمد ﷺ کی صورت میں نہ تھا۔ اشتراکِ فعل اِسی نتیجہ کو لازم آتا ہے مگر ابنِ عربی کے نقطۂ نظر سے تو یہ نتیجہ بھی

❶ فصوص الحکم، مترجم عبدالقدیر صدیقی، ص۳۶۹.

❷ الانفال: ۸/ ۱٦.

❸ کنزالایمان، ص۳۲۱-۳۲۲.

غلط ہے کیونکہ سامنے کون تھے؟ جی ہاں مشرکینِ مکہ، لیکن وہ بھی اسم مضل کی تجلی لیے ہوئے تھے اور اُن کی صورت میں بھی اللہ ہی جلوہ گر تھا، گویا وحدت الوجود کی رُو سے قتل کرنے والے اور قتل ہونے والے، قاتل و مقتول دونوں اللہ ہی تھے کیونکہ تمام صورتوں میں جلوہ گری اُسی کی ہے اور بقول ابنِ عربی:

> ''عارف کامل وہی ہے جو ہر معبود کو حق تعالیٰ کا مظہر جانے اور سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی کی عبادت اُن میں ہوتی ہے...... بعض بت پرست بھی اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہر بت کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن وہ اپنے اپنے معبودوں میں الوھیت کو حصر کرنے کے باعث کافر ہوئے اور بعض اس حقیقت سے واقف نہ تھے۔ وہ اپنے معبودوں کو محض وسیلہ اور شفیع جانتے تھے اور اللہ کو اُن کے سوا مانتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اُن کے پاس آئے اور ان کو الٰہ واحد کی طرف بلایا تو سمجھ گئے کہ کلمہ توحید سے مراد یہ ہے ''نہیں ہے الہ مگر اللہ، یعنی ہر الہ عین اللہ ہے۔ تب وہ حیران ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام معبودوں کا ایک معبود بنایا ہے۔ آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ ہر معبود کی صورت پر اللہ تعالیٰ کا ظہور ہے اور اے گروہِ کفار! تم کسی ایک معبود میں اُس ذات کو حصر نہ کرو، یعنی معبود مقید کی عبادت نہ کرو بلکہ معبودِ مطلق کی عبادت کرو۔'' [1]

بات نہایت واضح ہے کہ ''ہر الہ عین اللہ ہے'' لہٰذا صرف بتوں میں اللہ کو مقید کرنا الہ کی تحدید کرنا کفر، یعنی بتوں کو اللہ سمجھ کر پوجنا کفر نہیں۔

احادیث کے ساتھ وجودی رویہ فکر:

(۴)...... احادیثِ رسول ﷺ کے ساتھ بھی ابنِ عربی کا اندازِ فکر درست نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ محدثینِ کرام نے صحتِ حدیث کے لیے نہایت سخت معیار بنائے ہیں اور

[1] فصوص الحکم، محمد ریاض قادری، ص۱۹، ۳۱۸.

انسانی کوشش کی آخری حد تک اِس سرمایۂ رسول ﷺ کی حفاظت کی ہے۔ اس حقیقت سے شاید کوئی بھی انکار نہ کر سکے کہ تدوینِ حدیث اور معیارِ ردوقبول کے حوالے سے جتنی محنت اس شعبہ میں کی گئی ہے، کسی دوسرے علم میں نہیں کی گئی، محدثین نے محنتِ شاقہ سے نہ صرف احادیث جمع کیں بلکہ کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا۔ صحتِ حدیث کو جانچنے کے لیے اصولِ روایت اور اصولِ درایت موجود ہیں چنانچہ کسی شخص کا ذوقی یا کشفی معیار سرے سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ابنِ عربی کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے ذوقی یا کشفی معیار سے صحتِ حدیث کی جانچ کرنے کا اظہار کیا ہے، عبدالوہاب شعرانی شافعی نے بھی ''میزان الکبریٰ'' میں لکھا ہے کہ جب کسی حدیث کی صحت کے بارے میں جاننا ہو تو جب حضور پاک ﷺ کشف میں آئیں تو اُن سے پوچھ لیا جائے کہ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی ہے؟

ابنِ عربی بھی کہتے ہیں:

> ''بعض اوقات قطب ارشاد سے ایسا قول ظاہر ہوتا ہے جو بظاہر حکم میں کسی حدیث شریف کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ تحقیق وہ قول، اجتہاد سے ہے حالانکہ ایسا نہیں اور سوائے اس کے نہیں کہ قطب ارشاد امامِ وقت ہے۔ اس کے نزدیک وہ حدیث کشف کے طریقے سے حضور ﷺ سے ثابت نہیں ہوتی۔ اگر وہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہوتی تو البتہ وہ اُسی کے مطابق حکم کرتا اور یہ حکم کسی حدیثِ ضعیف کے متعلق نہیں بلکہ احادیثِ صحاح کے متعلق ہے جن میں راوی عادل اور ثقہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اقطابِ عارفین کے نزدیک بعض احادیث جو صحاح میں شمار کی جاتی ہے، ہرگز ہرگز جناب رسول ﷺ ﷺ سے ثابت ہی نہیں اور بعض احادیث جو ضعیف شمار ہونے کے باعث عالم میں متروک العمل ہیں، سوفیصدی صحیح ہیں اور جناب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ احادیث صحاح کا صحیح معیارِ کشف ہے۔ لہٰذا قطب ارشاد کا کوئی حکم شرعِ محمدیؐ کے خلاف نہیں

ہوسکتا۔ البتہ شرع اجتہادی کے خلاف ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا ہر حکم کشف پر مبنی ہے۔ یعنی وہ ہر حدیث کی صحت براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جملہ خلائف اور رُسل حضور ﷺ سے احکام اخذ کرتے ہیں۔'' [1]

وجودی دلائل کی حقیقت کشائی:

صحت و عدم صحت حدیث کے لیے کشفی معیار کو امت میں قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا۔ چنانچہ کسی کا کشف خود اُس کے لیے معیار ہو تو ہو، حدیث کی پرکھ کے لیے یہ قطعاً درست نہیں بلکہ کشف بذاتِ خود ایک نزاعی معاملہ ہے۔ [2] چنانچہ حدیث پر فکر محدثین کی ماننی ضروری ہے کیونکہ یہ اُنھیں کا شعبہ ہے۔ ابنِ عربی اور دوسرے صوفیا کے یہاں موضوع اور ضعیف روایات کی کثرت ہے۔ فصوص الحکم جو بقول ابنِ عربی نبی پاک ﷺ نے انھیں دی ہے، میں موضوعات شامل ہے۔ (كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا) والی روایت کے بارے میں کہا جاچکا ہے کہ یہ موضوع (جھوٹی) روایت ہے اس کی کوئی سند نہیں اور نہ یہ کسی معتبر

---

[1] فصوص الحکم، مترجم محمد ریاض قادری، ص ٦٤-٢٦٣.

[2] کشف کے لغوی معنی، پردہ اٹھانا، کھولنا، ظاہر کرنا، غیب کی باتوں کا اظہار، اصطلاح میں کشف اس کیفیت کا نام ہے: جس میں اچانک کسی مسئلہ کا حل یا کسی صورتِ حال کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ اِسی میں غیب کی باتوں سے آگاہ ہونا بھی شامل ہے۔ مگر غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، آگاہ کردیتا ہے، غیر نبی کے لیے سچا خواب، نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، جہاں تک کسی مسئلہ کا حل اچانک آجاتا ہے تو نفسیاتی لحاظ سے غلط ہے۔ شعور جب کسی مسئلہ پر واضح نہیں ہوتا تو وہ لاشعور میں چلا جاتا ہے اور لاشعور اُس پر قدیم ذہنی سرمایہ کی مدد سے کام کرتا ہے اور جب وہ مسئلہ حل ہوکر اچانک شعور کے حوالے کرتا ہے تو شعور کو اجنبی لگتا ہے، چنانچہ ہر فرد کو اس کے اپنے شعبۂ زندگی میں کشف ہوتا ہے۔ آرشمیدس جیسے اچانک ہی ننگا دوڑ پڑا کہ پالیا پالیا۔ اصولِ کثافت کے بارے میں مولوی کو مسائل میں کشف اور صوفی اپنی ذہنی کیفیت میں شیخ کو پاتا ہے۔ تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔
یہاں ابنِ عربی کا صرف ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

''ہر انسان اپنے خیال میں قوتِ واہمہ سے اُن چیزوں کو پیدا کرتا ہے جس کا وجود سوائے خیال کے خارج میں نہیں ہوتا ہے۔'' (فصوص الحکم، مولانا برکت اللہ، ص ٢٣١)]

مجموعہ یہاں تک صحاح ستہ میں بھی موجود نہیں۔ عربی میں تقریباً (18) کتب موجود ہیں جن میں موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُردو میں بھی چند کتب مثلاً فتنۂ وضعِ حدیث: مولانا محمد مسعود عالم قاسمی ،حدیث کا درایتی معیار: مولانا محمد تقی امینی اور ضعیف اور موضوع روایات :مولانا محمد یحیٰ گوندلوی، موضوعات سے آگہی کے لیے موجود ہیں اور عربی سے بعض کتب کے تراجم بھی چھپ چکے ہیں، لہٰذا احادیث رسول ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے قبل انسان کو سو دفعہ سوچنا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا وَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَه)) اللہ تعالیٰ اس آدمی کے چہرے کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی پھر اسے یاد رکھا یہاں تک کہ اسے آگے بیان کیا۔

وجودی فلسفہ اور توحیدی فکر:

وحدت الوجود کے بعض دوسرے مسائل بھی جاننا ضروری تھا مگر طوالت سے نجات حاصل کرنے کے لیے بات ختم کرنا ہی بہتر ہے، البتہ اس مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ توحید اور وحدت الوجود، الگ الگ ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں، توحید خالص دینی تصور ہے جبکہ وحدت الوجود، فلسفیانہ/ کلامی تصور ہے اور وحدت الوجود کے تحت چونکہ اللہ عین کائنات ہے، لہٰذا یہاں کائنات سے الگ اللہ کا کوئی تصور قائم کرنا فلسفہ وحدت الوجود سے بے بہرہ ہونا ہے، اسی طرح عبد، خلق، تخلیق یا حیات و کائنات کو مستقل یا علیحدہ وجود کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا مطلب وحدت الوجود کو رد کرنے سے عبارت ہے، لہٰذا نہایت واضح انداز میں ہمیں اس کا شعور ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ نے صرف اور صرف ''توحید'' کی دعوت دی اور یہ سیدھا سادا سا تصور ہے کہ اللہ خالق ہے اور حیات و کائنات مخلوق ہے۔ اللہ اور کائنات کے درمیان ''تخلیق'' کا رشتہ ہے جبکہ وحدت الوجود کے حوالے سے ''عینیت'' کا رشتہ ہے۔ یعنی اللہ عین کائنات ہے۔ صوفیاء اور شعراء کی وجہ سے وجودی فکر کو نہایت فروغ ملا اور شریعت کی پابندیوں سے فرار کا راستہ کھلا ہے اور آخری بات یہ کہ

وحدت الوجود، توحید کی دشمن ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے ''توحید'' کے تصور کو دھندلانے اور توجہ ہٹانے اور کمزور کرنے کے لیے یہ فلسفہ، کلامی انداز میں پیش کیا گیا تو غلط نہ ہوگا۔ پیارے رسول محمد ﷺ اس کتاب کو منسوب کرنا بھی درست نہیں کہ آپ نے واضح طور پر فرمایا کہ میں:

((اِنِّی قَدْ تَرَکْتُ فِیکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْ أَبَدًا کِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِیِّهٖ ﷺ.)) ❶

''میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جسے اگر تم مضبوطی سے تھام لوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے وہ کتاب اللہ اور اس کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔''

خود قرآن حکیم نے بھی تکمیلِ دین کا اعلان کر دیا اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کے بعد انسان یہ اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے کہ فصوص الحکم میں فلسفہ اور منطق کے مسائل کے بیان کا اسلوب و انداز قرآن و حدیث کے اسلوب و انداز سے کوئی مشابہت نہیں۔ لہٰذا وحدت الوجود ایک الگ فلسفہ ہے جسے مذہبی انداز میں پیش کیا گیا۔

صحت وضعف کا نیا معیار:

علمِ حدیث کے لیے اپنے کشف (گویا اپنے خیال و مرضی) کو معیار بنانے کے علاوہ وہ فلسفہ و منطق کو بھی اِسی کشفی دائرہ میں لانے اور اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ علت اور معلول کا قانون ایک ہمہ گیر قانون ہے اور عقل منطقی اس کی صحت پر حکم ہے۔ لکڑی جلے گی تو آگ پیدا ہوگی۔ لکڑی علت اور آگ معلول ہے۔ لکڑی اور آگ ایک چیز نہیں اور لکڑی آگ نہیں ہوسکتی اور آگ لکڑی نہیں۔ علت اور معلول میں فرق ہوتا ہے۔

علت اور معلول کا تعلق چونکہ لازمی ہے لہٰذا علت خود بھی کسی معلول کی علت ہوگی تو خود علت کا بھی معلول ہونا چاہیے، چنانچہ اس سلسلہ کو جب ماضی کی طرف لے جائیں

❶ المستدرك للحاكم ١/ ٩٣ حدیث نمبر ٣١٨ و سندهٗ حسن.

تو آخر میں صرف اللہ بچتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود اللہ کی بھی کوئی علت یا وجہ ہے؟ اس سوال کو فلسفہ علت العلل یا علت اوّلی سے حل کرتا ہے جو بجائے خود اصولِ علیّت کے خلاف ہے، دوسرا حل اس کا فلسفہ میں یہ اصول ہے کہ ''تسلسل باطل ہے'' یعنی ماضی میں آپ لاتناہی طور پر نہیں جاسکتے کیونکہ پھر ابتدا کیسے کریں؟

اصولِ علیّت کی حقیقت:

ابنِ عربی نے اس اصولِ علیّت سے نکلنے کے لیے فلاطینوس مصری کی طرح ایک کشفی حل نکالا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''امرِ عقلی کے ضعف پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ عقلا فکر ونظر سے یہ حکم لگاتے ہیں کہ معلول ہرگز علت کی علت نہیں ہوسکتا۔ یہ حکم عقلی ہے۔ واضح ہے مگر علمِ تجلی وکشف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی علت کی علت معلول بھی ہوجاتا ہے۔ عقل کا یہ حکم صحیح ودرست بشرطیکہ کشف وشہود سے قطع نظر کرلیں۔ کیونکہ اگر علت اپنے معلول کی معلول ہوجائے تو تقدم الشيء علی نفسہٖ اور دَور لازم آتا ہے جو محال ہے۔ علت کے معلول، معلول نہ ہونے میں زیادہ سے زیادہ عقل بے کشف وشہود جو کہہ سکتی ہے یہ ہے کہ جب دلیل کے قیاسات کے خلاف یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان صورِ کثیرہ میں ذاتِ واحدہ حقّہ ہی ہے تو اُن صُوَر کے لحاظ سے مختلف حیثیات و اعتبارات پیدا ہوتے ہیں۔ پس وہ ذاتِ واحدہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک معلول کی علت ہے، صورتوں میں ایک صورت میں تو وہ علت ہونے کی حالت وحیثیت سے معلول، معلول نہ ہوگی بلکہ اُس ذات کی صورتوں میں منتقل ہونے سے حکم بھی منتقل ہوگا۔ پھر وہ ایک اعتبار سے معلول، معلول ہوگی تو اُس کا معلول اُس کی علت ہوگا۔'' [1]

لیکن جیسا کہ وہ کہتے ہیں اُن کا یہ حل عقلی ومنطقی نہیں، پھر ثابت کیسے ہوا؟ کشف تو

[1] فصوص الحکم، مترجم: عبدالقدیر صدیقی، ص ۷۰-۳۶۹۔

دلیل نہیں، اور آخر یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ علت اپنے معلول کی علت ہونے کے بجائے اپنے معلول کا معلول ہو، اللہ کائنات کی علت ہے، کائنات معلول ہے اور اللہ معلول (کائنات) کا معلول (کائنات) ہے۔لہٰذا اللہ عین کائنات ہے۔ یہ ایک ایسا غیر منطقی نتیجہ ہے جو علیت کے قانون کو مسخ کر کے نکالا گیا ہے۔ جب اصولِ علیّت ختم کرنا ہے تو پھر اُسے استعمال کرنا تناقضِ بذات ہے اور یہی نہیں جب آپ علت ومعلول کے قانون کو استعمال کرتے ہیں تو دوئی لازم آتی ہے،علت اپنے معلول سے الگ پائی جاتی ہے۔لکڑی علت ہے،جب لکڑی جلے گی تو آگ پیدا ہوگی،آگ نتیجہ ہے۔اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لکڑی عین آگ ہے۔ چنانچہ وحدت الوجود اگر فلسفیانہ اور منطقی طریقہ سے ثابت نہیں ہوتی تو کشفی طریقہ سے بھی اسے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور بقول مرزا غالب:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں؟

حقیقت میں کائنات کی تشریح نہ وحدت الوجود ،نہ اصول علّیت وغیرہ سے ہوسکتی ہے۔ یہ نہایت سادہ سا اصولِ تخلیق ہے جسے کلامی انداز میں الجھا دیا گیا ہے۔

بقول مولانا حالیؔ:

دی ہے واعظ نے کن آداب کو تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ تو ترے کا کُل پیچاں میں نہیں

اسلام کی زلفوں میں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں، علامہ ابن حزم ایک ذیلی عنوان ''کیا عالم اور فاعل عالم دونوں ازلی ہیں؟'' کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ تو اُسے لازم آئے گا جو اس مقدمہ کو تسلیم کرلے کہ عالم کے لیے کوئی علت ہے، ہم تو کہتے ہیں ہر وہ شے جس کا وجود ہے اللہ کو اس کے وجود میں لانے کے لیے کوئی علت نہیں۔ وہ سوائے خالق اور اُس مخلوق کے کوئی چیز نہیں۔'' [1]

---

[1] الملل و النحل، ص٤٥ .

اور یہی کلی صداقت ہے کہ اللہ اور کائنات کے درمیان خالق ومخلوق کا رشتہ ہے اور فلاسفہ کے اِس خیال کے برعکس کہ عدم سے کوئی شے وجود میں نہیں لائی جاسکتی۔ اللہ جو ''بدیع'' ہے۔ عدم سے کائنات کو اپنے وقت پر جب اُس نے چاہا، وجود میں لایا۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ ہر ایک کا حساب لینے والا ہے۔ ساری تعریفیں، ساری عظمتیں، ساری بڑائیاں، ساری قوتیں صرف اور صرف اُسی کے لیے ہیں۔
بقول علامہ اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے

کچھ کتاب کے بارے میں تقابلی جائزہ:

آخر میں فصوص الحکم کے تراجم کے بارے میں ایک بات کہنا ضروری ہے، اُردو کے تین تراجم مطالعے میں تھے:

1. ......فصوص الحکم: مترجم: مولانا مولوی حافظ محمد برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محل لکھنو
2. ......فصوص الحکم: مترجم: مولانا محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی
3. ......شرح فصوص الحکم الایقان، مترجم وشارح: محمد ریاض قادری

ترجمہ کا یہ اصول ہے کہ مصنف کے خیالات من وعن پیش کیے جائیں، اگر کہیں اختلاف ہوتو حاشیہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے۔ فصوص الحکم میں ابنِ عربی نے جمہور علماء کے برعکس حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیا ہے، اس فص کا نام ہے ''فص حکمت حقیہ بکلمہ اسحاقیہ'' اور ابتدائی اشعار سے ہوتی ہے۔ پہلے شعر کا ترجمہ ہے:

''کیا نبی کا فدیہ قربتِ حق کے لیے ایک بچے کا ذبح کرنا ہے؟ کہاں مینڈھے کی آواز اور کدھر انسان کی آواز۔''[1]

مولانا برکت اللہ نے ترجمہ میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی جبکہ محمد ریاض قادری نے وضاحت کردی کہ جمہور علماء کے برعکس ابنِ عربی، اسماعیل علیہ السلام کے

[1] فصوص الحکم، مترجم: مولانا عبدالقدیر صدیقی، ص۱۰۷.

بجائے اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں، مگر مولانا عبدالقدیر صدیقی نے وضاحت کی کہ ابنِ عربی اسحاق علیہ السلام کو قربانی کیے جانے کا مسلک رکھتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ کے مطابق ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق کی قربانی کی، مگر پھر ترجمہ میں بھی وہ ''فص اسحاقیہ'' میں ابنِ عربی کی منشا کے برعکس اسماعیل علیہ السلام کا نام لکھتے ہیں۔

مصنف سے اتفاق کریں یا اختلاف، مگر مترجم کو ترجمہ میں اپنے مسلک یا نقطۂ نظر کی ترجمانی نہیں کرنی چاہیے۔ ''فصّ اسماعلیہ'' میں تو ابنِ عربی نے قربانی یا ذبیح کا نام تک نہیں لیا۔ ''فصّ اسحاقیہ'' میں بھی اگر اسماعیل علیہ السلام کا نام رکھ دیا جائے تو پھر تو قربانی کسی کی ہوئی ہی نہیں، مولانا عبدالقدیر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''شیخ نے بر بنائے شہرت ملکِ اندلس لکھ دیا ہے کہ اسحاق علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں، کیونکہ اس فص میں شیخ کا مقصود خواب کا تعبیر طلب ہونا ہے نہ کہ اس امر کی تحقیق کہ اسماعیل و اسحاق علیہما السلام میں سے کون ذبیح اللہ ہے؟''

(بر بنائے شہرت ملکِ اندلس لکھا تو پھر یہ عطائے محمدی ﷺ تو نہ ہوئی)

باب 3
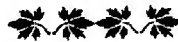
وحدت الشہود

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سی وضاحت ''وحدت الشہوذ'' کی بھی کر دی جائے کیونکہ مشہور ہے کہ مجدد الف ثانی احمد سرہندی نے یہ فلسفہ پیش کیا جبکہ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ احمد سرہندی ''وحدت الوجوذ'' کو ہی ''وحدت الشہوذ'' کہتے ہیں۔ اُن کے خیال میں وحدت الوجود دراصل ایک نفسی کیفیت ہے بالکل اس طرح جس طرح مجنوں کو ذہنی کیفیت کے تحت ہر طرف لیلیٰ ہی لیلیٰ نظر آتی ہے، بالکل اُسی طرح سالک جب سلوک کی منازل طے کرتا ہے تو اُسے جذب وکیف کے عالم میں ہر طرف اللہ ہی اللہ دکھائی دیتا ہے۔ گویا اُسے شہود یعنی ظاہر میں وجود واحد نظر آتا ہے، اپنی اس نفسی کیفیت کے تحت وہ ماسوا کو دیکھنے کی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بقول میر تقی میر: ؎

سراپا میں اُس کے نظر کر کے
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

احمد سرہندی کہتے ہیں کہ سالک کو شہود میں وحدت کا نظر آنا، یہ سلوک کا ابتدائی درجہ ہے، گویا شہود میں وحدت ہے، حقیقت میں وحدت نہیں۔ مولانا شاہ محمد ہدایت علی صاحب جے پوری، تلخیص مکتوبات امام ربانی الموسوم بہ دُرلاثانی مکتوب نمبر ۳۱، احمد سرہندی فرماتے ہیں:

''تھوڑی مدت میں توحید وجودی منکشف ہوگئی اور اس کشف میں حد سے زیادہ ترقی ہوئی اور اس مقام کے علوم ومعارف ظاہر ہوئے اور اس مرتبہ کے دقائق پر شاید ہی کوئی دقیقہ رہ گیا ہو جس کو فقیر پر منکشف نہ کیا گیا ہو اور شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کے دقائق کو جیسے کہ چاہیے، ظاہر فرمایا اور جس تجلی کے بارے میں شیخؒ نے فرمایا کہ اس سے آگے عروج نہیں ہے، اُس

سے بھی مشرف فرمایا...... یہ حال برسوں رہا، ناگاہ عنایتِ خداوندی شاملِ حال ہوئی اور بیچونی و بے چگونی کے چہرہ ڈھاپنے والے سے پردہ کو دور کر دیا اور وہ علوم جو اتحاد اور وحدت الوجود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونے لگے اور یہ معلوم ہوا کہ ان علوم کا جو وحدت وجود میں ظاہر ہوئے تھے، علمِ ذات وصفات سے اس کا کچھ تعلق نہیں، بلکہ جو علوم علمائے حقانی شریعت نے بیان فرمائے ، بالکل صحیح ودرست ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان علمائے شریعت کو جزا دے۔ خدا، خدا ہے اور عالم، عالم ہے۔'' (ص ۲۹، ۳۰)

عقیدہ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست:

مکتوب نمبر ۳۴۰ میں کہتے ہیں:

''ہمہ اوست کا کہنا ہم نئی بات جانتے ہیں اور ہمہ از اوست پر تمام علماء کا اتفاق واجماع ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ پر جواَب تک ملامت چلی آتی ہے، وہ صرف اسی مقولہ ہمہ اوست کی وجہ سے ہے اور فقیر نے جس قدر معارف لکھے ہیں، اُن کا محاصل ہمہ از اوست ہے۔'' [1]

مقامِ وحدت الوجود کو رَد کرنے اور اسے سالک کی نفسی کیفیت قرار دینے کے بعد شیخ احمد سرہندی دوسرے مرتبہ پر ترقی کر کے ''مقام ظلیت'' پر چلے گئے اور اس مرتبہ پر اُن کا خیال تھا کہ وحدت الوجود تو غلط ، مگر وجود کے ساتھ ممکن کی نسبت عکوس واظلال کی ہے۔ گویا ممکن کا وجودِ مرتبہ ظلّیت میں ثابت ہے؛ پھر انھوں نے وجود کے برعکس ظلال وعکوس کو صفاتِ حق کا اظہار خیال کیا۔ لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے اور ہمارے کشف وشہود اور دید ودانش سے مبرّا ومنزّہ ہے۔ جو حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یہ حالات فقیر پر ابتدائی سلوک میں گزرے ہیں؛ یعنی ظل کو عین جانا ہے لیکن

[1] ایضاً، ص ۱۴۵۔

فضلِ حق سے جب سے اس مقام سے ترقی ہوئی تو اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ظل اسماء صفات ہیں اور عدم محض میں ان کے وجود نے استحکام حاصل کیا ہے ورنہ ذات وصفاتِ حق اس سے وراء الوراء ہے۔ [1]

شیخ سرہندی اور مقامِ ظلّیت:

تاہم شیخ احمد سرہندی کو اس مقام یعنی ''مقامِ ظلیت'' سے ترقی نصیب ہوئی تو آپ مقامِ عبدیت پر صعود کر گئے اور معلوم کر لیا کہ اللہ، اللہ ہے اور بندہ بندہ، ہر دو کے درمیان ابن عربی کے مطابق عینیت کا رشتہ ہے نہ ظلیت کا بلکہ عبدیت کا رشتہ ہے اور یہی انسان کا اصل مقام ہے۔ قاضی قیصر الاسلام نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے انگلش زبان کے مقالے ''مجدد کا نظریۂ توحید'' کے ترجمہ وتلخیص کرتے ہوئے ان تمام احکامات کو بیان کیا ہے۔ شیخ احمد سرہندی کہتے ہیں:

> ''بعدازیں ایک بالکل نیا روحانی ادراک میری روح پر غالب آ گیا اور میں نے معلوم کیا کہ میں آئندہ ''وحدت وجود'' کو نہیں مان سکتا۔ تاہم مجھے اپنے کشف کے اظہار میں تامل تھا، کیونکہ میں عرصۂ دراز تک وحدت وجود کا معتقد رہ چکا تھا۔ آخرکار مجھ پر اس کا انکار بصراحت تمام لازم آیا۔ مجھ پر یہ منکشف ہو گیا کہ وحدت وجود ایک ادنیٰ مقام ہے اور میں ایک بالاتر مقام پر پہنچ گیا ہوں یعنی ''مقامِ ظلّیت'' پر۔ اگرچہ میں اب بھی دراصل وحدت وجود کے انکار پر راضی نہ تھا، کیونکہ تمام بڑے بڑے متصوفین نے اسے مانا تھا، لیکن اس کا انکار ایک ناگزیر واقعہ ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ میری آرزو تھی کہ میں مقامِ ظلیت ہی میں رہوں۔ کیونکہ ظلیت کو وحدت وجود سے ایک نسبت تھی۔ اس میں مَیں ''اپنے تئیں'' اور اس عالم کے تئیں خدا کا ظل محسوس کرتا تھا۔ لیکن فضلِ خداوندی دستگیر ہوا اور میں ایک اعلیٰ مقام ''عبدیت'' پر فائز ہو گیا۔ تب میں نے معلوم کیا کہ عبدیت تمام دوسرے مقام سے بالاتر مقام ہے اور مجھے

---

[1] کتاب مذکور، مکتوب نمبر ۴۷۹، ص ۲۴۳۔

''وحدت وجود'' اور ''ظلیت'' میں رہنے کی آرزو پر ندامت ہوئی۔''❶

مندرجہ بالا گفتگو سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ شیخ احمد سرہندی نے کوئی وحدت الشہود کا فلسفہ نہیں پیش کیا بلکہ وہ وحدت الوجود ہی کو وحدت الشہود کہتے ہیں اور اسے سالک کی نفسی کیفیت قرار دیتے ہوئے مقامِ سلوک میں ایک ادنیٰ درجہ خیال کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہمیں تخلیق کے بارے میں اسلامی تصور ہی ملتا ہے جیسے وہ ''ہمہ از اوست'' کہتے ہیں یعنی ہمہ (زمین وآسمان ومافیہا) کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہوئے اسے اللہ کی تخلیق قرار دیتے ہیں اور اللہ کے دیدار کو بھی کشف وغیرہ کے حوالے سے رَد کرتے ہوئے علماء ظاہر کے اقرار یعنی ''یومنون بالغیب'' پر ایمان لانے کی تلقین کرتے ہیں۔

''حضرت مجدد پھر فرماتے ہیں کہ مجھے عبدیت کے مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ میرے سابقہ تمام مشاہدات محض موضوعی نوعیت کے تھے اور اسی لیے ناقابلِ بھروسہ تھے۔ خدااورانسان کے مابین کسی عنیت کی اب کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ سالک کے بتدریج مشاہدات کی معروضی صحت کا معاملہ زیادہ قابلِ اعتماد اورراسخ ہوگیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہوا کہ سالکین کے تمام سابقہ تجربات حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں محض ایک ملحدانہ صورتِ حال تھی۔ غرض کہ مرتبۂ عبدیت پر فائز ہونے کے بعد مجددؒ پر خدا اور کائنات کی ثنویت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوگئی۔❷

اِسی فکری پس منظر میں جہاں خدااور کائنات الگ الگ اثبات کرتے ہیں اور وجود کی وحدت کا تصور دم توڑ دیتا ہے، مولانا شاہ محمد ہدایت علی صاحب جے پوری لکھتے ہیں:

''شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف جو آپ کی تحقیقات ہیں، وہ بالکل درست ہیں کیونکہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ؒ کی تحقیق اور بیان خلافِ قرآن شریف ہے اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے۔''❸

❶ فلسفہ کے بنیادی مسائل، ص۴۴۹۔ ❷ کتاب مذکور، ص۴۵۱۔

❸ تلخیص مکتوبات، امام ربانی الموسوم بہ درلاثانی، ص۲۵۱۔

وسیلہ

''وسیلہ'' کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ ہماری مذہبی زندگی میں یہ لفظ بطور اصطلاح داخل ہوگیا ہے اور یہ اصطلاحی مفہوم میں توحید کے راستے میں رکاوٹ بن چکا ہے۔

''وسیلہ'' سے مراد مذہبی مفہوم میں وہ شخص یا شے ہے جو انسان کی اللہ تعالیٰ تک رہنمائی کرے یا اُس تک رسائی کا باعث ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تک رسائی مسلمانوں کا مقصود ہے، مگر طریقہ کار کی غلطی سے اس کام میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ارشاد اللہ مان نے اپنی کتاب ''حق کی تلاش'' میں بیان کی ہے اور یہی بات اُن کی ہدایت کا ذریعہ بنی۔ (ضمناً یہ بھی بتاتا چلوں کہ توحید اور رسالت کی تفہیم کے لیے یہ بہترین کتاب ہے جس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے)

وہ سب خاموش ہوگئے:

ارشاد اللہ مان کہتے ہیں:

> ''ایک مولوی صاحب کہ نام جن کا مولوی نوری قصوری تھا، مائیک پر تشریف لائے، انھوں نے تقریر شروع کی اور تقریر کے دوران ایک واقعہ سنایا، جو کچھ یوں تھا: ''جنید بغدادی بغداد کے رہنے والے تھے۔ اس شہر کے ساتھ دریائے دجلہ بہتا ہے۔ جنید بغدادی جائے نماز لے کر دریا کے کنارے تشریف لائے اور دریا کے کنارے پر جائے نماز بچھا کر دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ اس کے بعد جائے نماز کو اٹھا کر دریا کے بہتے پانی میں رکھ دیا اور ساکن جائے نماز پر دو نفل نماز ادا کی، پھر جائے نماز کو دریا کے دوسرے کنارے چلنے کا حکم دیا، دوسرے کنارے پہنچ کر پھر جائے نماز بچھا دی، دو نفل نماز ادا کی پھر جائے نماز اٹھا کر

انھوں نے دریا کے اندر بہتے پانی پر رکھ دی اور خود اس کے اوپر بیٹھ گئے اور جائے نماز کو واپس شہر کی طرف مسلسل چلتی رہی۔ ابھی تھوڑی ہی دور دریا کے اندر جائے نماز گئی تھی کہ قریبی جنگل سے ایک آدمی نکلا، اس نے کہا: مجھے بھی بغداد شہر جانا ہے۔ جنید بغدادی نے جائے نماز کو حکم دیا کہ واپس کنارے پر لگ جاؤ، چنانچہ اس آدمی کو بھی جائے نماز پر بٹھالیا۔ جنید بغدادی نے اسے حکم دیا کہ تم یا جنید! یا جنید! کہتے رہو اور میں یا اللہ! یا اللہ! کہوں گا، وہ سامنے بغداد شہر ہے، ہم ابھی پہنچ جائیں گے۔ اس آدمی نے یا جنید! یا جنید! کہنا شروع کیا اور جنید بغدادی یا اللہ! یا اللہ! کہتے رہے اور جائے نماز دریا کے اندر بہتے پانی پر بغداد شہر کی طرف چلنے لگی۔ جب آدھا سفر طے ہوگیا تو شیطان نے اس آدمی کے کان میں پھونکا کہ تم شرک کر رہے ہو کہ تم غیر اللہ کو پکار رہے ہو، جیسا کہ شیطان ان کے کان میں پھونکا کرتا ہے۔ اس آدمی نے سوچا بات تو ٹھیک ہے، چنانچہ اس نے یا جنید! کی بجائے یا اللہ! یا اللہ! کہنا شروع کردیا۔ یہ کہنا تھا کہ وہ پانی میں ڈوبنے لگا، جب جنید نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اس کو بالوں سے پکڑ کر جائے نماز پر بٹھایا اور فرمایا: تمھارے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا کہ تم جنید تک تو ابھی پہنچے نہیں اور اللہ کو لگے ہو پکارنے!''

مولوی نوری قصوری کی اس بات نے میرے تن بدن میں آگ لگادی۔ حالانکہ مجھے نہیں پتہ تھا کہ بریلوی کیسے ہوتے ہیں؟ دیوبندی کیا ہیں؟ اہل حدیث کون ہیں؟ اور یہ کہ شیعہ کیا چیز ہیں؟ کیونکہ میں نے میٹرک اور ایف ایس سی میں صرف اسلامیات پڑھی تھی، اس کے علاوہ میرا مذہبی مطالعہ نہ تھا۔ میرے نزدیک مولوی نوری قصوری کی بات اللہ کے حضور بہت بڑی گستاخی تھی، چنانچہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اور مجھے تحقیق کرنی چاہیے کہ اصل دین کیا ہے؟ پھر ۱۹۶۲ء سے لے کر ۲۰۰۵ء تک میں نے

مسلسل یہ تحقیق کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں جو دین دیا ہے، وہ کیا ہے؟'' ❶

یہاں آپ ذرا غور فرمائیں کہ جنید بغدادی ہو یا کوئی دوسرا انسان، آخر شریعت اسلامیہ میں کس نے یہ درس دیا ہے کہ اللہ تک رسائی کے لیے پہلے کسی فرد تک رسائی حاصل کر چکو تو پھر اللہ تعالیٰ تک رسائی کا سوچو؟ اس سے قبل غیر اللہ تک رسائی حاصل کرنے میں وقت صرف کرو اور خدا جانے یہ رسائی عمر بھر پوری ہو نہ ہو۔ جائے نماز پر بیٹھ کر بھی رسائی نہیں تو پھر کیسے رسائی ہوگی؟

وسیلہ کی حقیقت اور عوام:

''وسیلہ'' کا لفظ عربی زبان میں، اُردو زبان کے برعکس تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

وسیلہ: بمعنی تقرب

وسیلہ: بمعنی مقام، جس کے لیے اذان کے بعد دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی پاک ﷺ کو آخرت میں عطا کرے۔

وسیلہ: بمعنی ذریعہ (اُردو میں صرف یہی معنی ہیں)

قرآن پاک کی جن دو آیات سے استدلال کیا جاتا ہے، اُن میں پہلی آیت میں وسیلہ بمعنی ''تقرب'' اور دوسری آیت میں وسیلہ بمعنی ذریعہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵ ﴾ ❷

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اُس کا قرب تلاش کرو اور اُس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تمھارا بھلا ہو۔''

اس آیت کی وضاحت میں حافظ صلاح الدین یوسف نے، تفسیر احسن البیان میں امام

---

❶ حق کی تلاش، ص ۳۰۔۳۱۔

❷ المائدہ: ۵/ ۳۵.

شوکانی کا قول نقل کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے:

''وسیلہ جو قربت کے معنی میں ہے، تقویٰ اور دیگر خصال خیر پر صادق آتا ہے۔ جن کے ذریعے سے بندے اپنے رب کا قرب حاصل کرتے ہیں۔''

(ص ۳۰۲)

﴿وَجَاهِدُوْنِي سَبِيْلِه﴾ اللہ کے راستے میں جدوجہد کرو' کے الفاظ اپنے اندر وسیع مفہوم کے حامل ہیں جس میں جہاد جیسے عظیم عمل کے علاوہ پوری زندگی کو صراط مستقیم پر لگا دینا شامل ہے، مگر یہ دیکھیے کہ جہاد اور راہِ خدا میں تمام تر جدوجہد کا ذکر، وسیلہ کے ساتھ کر دیا گیا، جو اصل میں ''عبادت یا عمل'' ہی ہے اور اسی ''عمل'' کی طرف اس مشہور آیت کریمہ میں بیان ہے۔ جس میں کہا گیا کہ ''جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا۔''

گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت، اُس کے راستے میں جدوجہد، قربتِ خداوندی کا وسیلہ ہے۔

قرآن حکیم کی دوسری آیت جس میں وسیلہ کا لفظ ''ذریعہ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نہایت عجیب وغریب انداز میں خود مروّجہ انداز کے ''وسیلہ'' کو رَد کر رہی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اگر آپ سیاق کلام میں دیکھیں تو واضح طور پر غیر اللہ کے پاس ایسی طاقت کی نفی کی جارہی ہے جو نفع یا نقصان پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ جب طاقت نہیں تو پھر پکارنا کیسا؟ وہ خود بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے لیے وہ خود بھی ایسے وسیلہ کے طالب ہیں جو انھیں اللہ سے قریب کر دے۔ قرآن حکیم کی آیات ملاحظہ فرمائیے:

ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿٥٧﴾﴾ [1]

---

[1] بنی اسرائیل: ۱۷/ ۵٦، ۵۷.

''کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوا جنھیں تم (معبود خیال کرتے ہوئے) انھیں پکارو، وہ نہ تم سے تکلیف دور کر سکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کی طرف (پہنچنے کا) ذریعہ تلاش کر رہے ہیں کہ (دیکھیں) کون ان میں سے اللہ کا زیادہ مقرب بنتا ہے اور اس کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے رب کا عذاب ہے ہی اس قابل کہ اُس سے ڈرا جائے۔''

ڈاکٹر محمد عثمان اپنے ترجمہ قرآن اور تشریح ''الکتاب'' میں دوسری آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آیت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جن معبودانِ باطل کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے، اُن سے مراد پتھر یا لکڑی کے بت نہیں ہیں بلکہ گزر ہوئے اولیاء ،انبیاء ،فرشتے اور جنات ہیں۔ بت کب تقرب الی اللہ کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں اور اللہ کے عذاب سے خائف رہتے ہیں۔'' (ص ٦٦٧)

کون سا وسیلہ جائز ہے؟

مندرجہ بالا وضاحتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور برگزیدہ بندے خود بھی اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اُنھیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جائے، مزید یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ڈر رکھتے ہیں، اس لیے کہ انسان کے ساتھ خطا کا لزوم ازل سے ہے اور کوئی بھی فرد خواہ وہ دنیوی یا روحانی لحاظ سے کتنے بڑے مرتبہ ومقام پر ہو بہر حال اللہ کا بندہ ہے اور معصوم نہیں، دنیا میں صرف انبیاء معصوم ہوتے ہیں، مگر بتقاضائے بشریت ان سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے، مگر اُن کی اسی دنیا میں بذریعہ وحی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر نبی، ہر حال میں قابلِ اتباع نہیں ہوتا، ہر عہد کا نبی معیارِ حق ہوتا ہے۔ غرض یہاں یہ بات قرآن حکیم نے نہایت مستحکم انداز میں واضح کر دی ہے کہ جنھیں لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، (جی ہاں غیب میں مدد کے لیے پکارنا عبادت ہی

ہے) وہ وسیلہ تو کیا بنیں گے، خود وسیلہ کی تلاش میں ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کی تفسیر کا یہ حصہ دوبارہ پڑھ لیجیے کہ کس طرح لوگ وسیلہ ڈھونڈنے والوں کو وسیلہ سمجھ لیتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکم ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں اُنہی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے، میری مراد آپ ہی برلائیں گے تو برآئے گی۔ یہ حرکت اول تو بجائے خود سخت حماقت وجہالت ہے، لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جبکہ اصل حاکم ذی اختیار سامنے موجود ہواور عین اس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جارہی ہیں۔ پھر یہ جہالت اپنے کمال پر اس وقت پہنچ جاتی ہے جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جارہی ہے وہ خود بار بار اس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں، میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔''[1]

شرعی وسیلہ اور دنیوی مثالیں؟

اب سوال یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ تک رسائی کا کیا ذریعہ یا وسیلہ ہے؟ یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھیے کہ وسیلہ کے تصور میں دوئی اور دوری کا تصور شامل ہے، مثلاً آپ

[1] تفہیم القرآن، جلد۴، ص۴۱۹۔

لاہور جانا چاہتے ہیں تو گاڑی یا ریل یا ہوائی جہاز آپ کے لیے وسیلہ یا ذریعہ ہے، جس کے ذریعہ آپ لاہور پہنچ جاتے ہیں۔ منزل پر پہنچتے ہی آپ وسیلہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ فی الحال یہ آپ کے لیے بے کار ہو گیا، مقصد حاصل ہو گیا۔ اب جب دوبارہ مقصد پیدا ہو گا تو وسیلہ کی ضرورت ہو گی۔ یوں گویا وسیلہ ایک ثانوی چیز ہے، جسے مقصد اپنی حصول کے لیے استعمال کر کے چھوڑ دیتا ہے اور یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ مقصد (لاہور) تک رسائی کے لیے وسیلہ (گاڑی، ریل گاڑی، ہوائی جہاز) کوئی بھی وسیلہ آپ اختیار کر سکتے ہیں گویا وسیلہ کا انتخاب آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ دوسرا وسیلہ میں دوری کا تصور کہ آپ میں اور لاہور میں یا آپ میں اور آپ کے دفتر میں دوری (فاصلہ) ہے جس کے لیے آپ وسیلہ کے محتاج ہیں۔

مشرکین اور وسیلہ کی حقیقت:

اب سوال یہ سامنے آیا کہ کیا اللہ تعالیٰ اور ہم میں دوری (فاصلہ) نہیں کہ ہمیں رسائی کے لیے وسیلہ کی ضرورت ہے؟ مشرکینِ مکہ کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے دور ہے اور بہت زیادہ عظیم و برتر ہے، لہٰذا انھوں نے عظمت اور دوری کے تصور کے لیے ''بت'' بطور وسیلہ بنا رکھے تھے جو اُن کے بزرگوں کی نمائندگی کرتے اور اُن کی عبادت وہ صرف اس لیے کرتے تھے کہ یہ بت انھیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں، رسائی کا باعث ہوں۔ چنانچہ انھیں شرک پر متنبہ کیا جاتا تو وہ بزبانِ قرآن کہتے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾

''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔''

گویا مشرکین کا مقصود بھی اللہ تعالیٰ ہی تھا، بت اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے وسیلہ تھے اور شرک کا مفہوم ہی یہی ہے کہ اس میں خالص عبادت جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، نہیں رہتی، آمیزش ہو جاتی ہے۔

پھر اللہ کو مقصود سمجھتے ہوئے وہ اپنی مشرکانہ روش کی ایک اور توجیہ دیتے کہ ہم بتوں کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ یعنی وہی وسیلہ، ارشاد ہوتا ہے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ❶

ہر دو آیات میں آپ نے غور کیا کہ بت درمیانی مقام کے حامل ہیں، وہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے ''وسیلہ'' یا ''سفارشی'' ہیں اور مقصود اللہ ہی ہے۔ ❷

اسلام نے ایک تو اللہ تعالیٰ کی دوری کے تصور کو رد کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا تصور دیا جو انسانوں کے قریب ہے، فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۝۱۸۶﴾ ❸

''جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو جب وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہی بھلائی کا راستہ ہے۔''

اور اس قربت پر ایک اور اضافہ ملاحظہ ہو، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۝۱۶﴾ ❹

---

❶ یونس: ۱۰/ ۱۸.

❷ بظاہر تو مقصود اللہ ہی ہوتا ہے مگر عشق، شعور میں وہ فتور پیدا کر دیتا ہے کہ عملاً انسان، وسیلہ کو ہی مقصود سمجھ رہا ہوتا ہے۔ خود اُس فرد کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ بقول مرزا غالب: ؎

چاہت کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

❸ البقرة: ۲/ ۱۸۶.

❹ ق: ۵۰/ ۱٦.

”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں، اُن سے ہم واقف ہیں، اور ہم اُس کی رگِ جاں (شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ جو رب اتنا قریب ہے تو اُس کے لیے وسیلہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دراصل انسانوں نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، علوِ شان اور زور وقوت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اِس رویے کا گلہ کیا ہے اور انتہائی منطقی دلیل ومثال کے ساتھ انسانوں کو اپنی قوت وطاقت کا احساس دلایا۔

غیروں کا وسیلہ اور اللہ کی ناقدری:

ذرا اُس آیت کریمہ کو دوبارہ دیکھیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ﴾ [1]

”لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، ذرا کان لگا کر سن لو! اللہ کے سوا جن جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی (بھی) تو پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ سارے کے سارے اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو چھڑا نہیں سکتے، طلب گار (مانگنے والا) اور مطلوب (جس سے مانگا جا رہا ہے) دونوں کمزور، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر ہی نہیں جانی، جیسا کہ اُس کے جاننے کا حق ہے۔ بلاشبہ طاقت والا اور زبردست تو اللہ ہی ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی ذات اِس سے بلند اور پاک ہے کہ کوئی اس کی ناقدری کر سکے یا اُس کی عظمت و شان میں کمی کر سکے مگر غیر اللہ کو غیب میں مشکلات اور حاجات کے لیے پکارنے والا اپنے تئیں (اللہ کو چھوڑ کر) اللہ کی ناقدری کرتا ہے، اگر اُسے ذرا بھی شعور ہوتا تو وہ

[1] الحج: ٢٢/ ٧٤.

جان جاتا کہ جس کو وہ پکار رہا ہے، اگر مکھی ایسی کمتر شے نہ پیدا کرنے پر قادر ہے نہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لینے پر قدرت رکھتا ہے تو ہمارے کس کام آ سکتا ہے، پھر کیوں ایک ایسا Risk لیا جائے جو شرک کے زمرہ میں آتا ہے اور کیا اللہ تعالیٰ زور وقوت رکھنے کے باوجود اس بات پر قادر نہیں کہ وہ پکارنے والے کی پکار سنے اور اسے عطا کر سکے؟

مندرجہ بالا گفتگو سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اللہ کو پسند نہیں کہ کوئی غیر کو فوق الاسباب طریقے یعنی غیب میں مدد کے لیے پکارے اور اس صورت میں تو اور بھی بُرا ہے کہ اللہ اُس کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، لہٰذا انسانوں پر قیاس کرکے وسیلے اور سفارشیں تلاش نہ کی جائیں کہ انسان کا علم اور اللہ کا علم برابر نہیں، اللہ تو دلوں کے وسوسوں سے آگاہ ہے، یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قرب کا مطلب وجودی نہیں بلکہ علمی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت سے انسانوں کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب اور دلوں کے وسوسوں کا جاننے والا ہے۔

اللہ تک رسائی مگر کیسے؟

اب سوال پھر ایک بار ہمارے سامنے ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ اور کیوں ہمیں انسانوں، جنوں اور فرشتوں کے وسیلوں کی ضرورت نہیں؟

مسلمان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی کا طالب ہے اور اس حوالے سے وہ اللہ تعالیٰ کی جنت کو طلب کرتا ہے اور جہنم سے پناہ مانگتا ہے۔ گویا تعلق باللہ پر مسلمان کی دنیوی اور اُخروی کامیابی کا دارومدار ہے، ہمیں یہ رضامندی اور خوشنودی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

اس کا طریقہ کار خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾ [1]

[1] آل عمران : ۳/ ۳۱، ۳۲.

''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے واقعی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑ لیں، تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

مندرجہ بالا آیات اس معاملہ میں صریح ہیں کہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ اتباعِ رسول ﷺ ہے (فَاتَّبِعُوْنِیْ) دوسری آیت میں پھر مکرّر اللہ کے ساتھ اطاعتِ رسول کا حکم ہے، حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول کی پھر تاکید کرکے واضح کردیا کہ اب نجات اگر ہے تو صرف اطاعتِ محمدی میں ہے اور اس سے انحراف کفر ہے اور ایسے کافروں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا، چاہے وہ اللہ کی محبت اور قرب کے کتنے ہی دعویدار ہوں۔ اس آیت میں حجیت حدیث کے منکرین اور اتباعِ رسول ﷺ سے گریز کرنے والوں، دونوں کے لیے سخت وعید ہے کیونکہ دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جسے یہاں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ'' ❶

ایک اور آیت ملاحظہ ہو وہ بھی صریحاً ،اتباعِ رسول ﷺ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور ابدی طور پر اُسوۂ رسول ﷺ کو مسلمانوں کے لیے بلکہ انسانوں کے لیے اللہ سے قربت اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ ❷

''یقیناً تمھارے (مسلمانوں/انسانوں) لیے اللہ کے رسول ایک بہترین نمونہ ہیں، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ سے ملنے اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہو

❶ تفسیر احسن البیان، ص۱۷۰۔ ❷ الاحزاب: ۳۳/ ۲۱.

اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔“

مندرجہ بالا آیات اس بارے میں صریح ہیں کہ وسیلہ، اتباعِ رسول ﷺ ہے جو دراصل نام اُن اعمال و افعال کا ہے جو سنت کے مطابق ہوں، اگر طریقۂ رسول ﷺ سے ہٹ کر کوئی عمل کیا جائے گا خواہ وہ کتنی نیک نیتی سے کیا جائے، اللہ کے یہاں مقبولیت حاصل نہیں کرسکتا۔ عمل کی قبولیت کی تین شرائط ہیں:

❶ ...... توحید ہو شرک نہ ہو۔ ❷ ...... سنت ہو بدعت نہ ہو۔ ❸ ...... اخلاص ہو ریا کاری نہ ہو۔ اعمالِ صالحہ سے قربِ خداوندی پر، دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً واضح طور پر کہا گیا: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾: سجدہ کر اور قریب ہو جا۔“

شرعی وسیلہ کی حدود:

تمام عبادات جو دراصل انسان کی تخلیق کا مقصدِ اولیں ہیں، قربِ خداوندی کا باعث ہیں چنانچہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد، اگر وہ سنت نبوی کے مطابق ہیں تو اللہ تعالیٰ کی قربت اور نزدیکی کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی وسیلہ ہیں اور آپ ﷺ نے بیشتر دعاؤں سے قبل ان ناموں کا وسیلہ اختیار کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ”آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی: اے خدا! ترے ہر اُس نام کے وسیلہ سے جو تُو نے اپنے لیے رکھا یا اپنی کتاب میں اُتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لیے اپنے علمِ غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی: خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا، تجھ سے درخواست کرتی ہوں......“ [1]

[1] سیرت النبیؐ، جلد چہارم، ص ۴۹۴۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے ناموں کے ذریعے یا وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں 'دعا' ایک بہترین وسیلہ ہے۔ قربت اور رضامندیٔ خداوندی کا اسی طرح کسی نیک انسان سے دعا کی درخواست کرنا بھی اچھا عمل ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی دعا کروائی اور سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ سے بارش کے لیے دعا کروائی۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ:

> [فارسی سے ترجمہ] ''یعنی اس واقعہ (سیّدنا عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کرانے) سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام گزرے ہوئے (فوت شدگان) اور غائب لوگوں کا وسیلہ پکڑنا جائز نہیں سمجھتے تھے ورنہ سیّدنا عباس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ سے بہتر نہ تھے۔ (اگر فوت شدہ سے دعا کرنا جائز ہوتا) تو انہوں نے کیوں نہ کہا کہ اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی کے ساتھ وسیلہ پکڑتے تھے، اب تیرے نبی کی روح کے ساتھ پکڑتے ہیں۔''[1]

دعا کرانے کی اِس رخصت سے خانقاہوں اور مزاروں پر جا جا کر زندہ یا مردہ افراد سے دعائیں کرانے کا جواز لینا مناسب نہیں، اس طرح جو خرابیاں جنم لے رہی ہیں، آج کے الیکٹرونک میڈیا پر اُس کو نمایاں کیا جارہا ہے نیز ایسے عامل اور نجومی جو اخبارات میں اشتہارات دے کر سادہ لوح عوام کو لوٹ رہے ہیں، اُن سے ایمان اور دولت کو بچانا بھی ضروری ہے، دعا کے لیے اپنے آس پاس کے کسی بھی نیک فرد سے درخواست کی جاسکتی ہے بلکہ ہر ملنے والے سے کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس کے درجات بلند ہیں؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لیے ظاہر شکل وصورت کا ہر حال میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور سب سے اہم بلکہ اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے والدین زندہ ہیں یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہے تو سب سے بڑے بزرگ اور پیر وہ ہیں، اگر کسی شخص کے حق میں اُس کی والدہ یا والد کی دعا قبول نہیں ہورہی تو پھر صبر کرنا چاہیے کہ ابھی اللہ

[1] البلاغ المبین، ص۱۶، بحوالہ قبر پرستی، حافظ صلاح الدین یوسف، ص۱۲۔

تعالیٰ کی مرضی نہیں ہے، وقت سے پہلے نہیں اور مقدر سے زیادہ نہیں۔ اور ہر دو بات کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ مسلمان کی دعا رد نہیں کرتا صرف اس کے نتائج کو اپنی مرضی پہ منحصر کرتا ہے اور وہ بھی مسلمان کی بہتری کے لیے، کیونکہ کیا ہمارے حق میں بہتر ہے اور کیا بُرا ہے؟ اس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کا ذکر دو مرتبہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کو انفرادی طور پر کہا ہے اور بتکرار کہا ہے کہ مجھے پکارو، مجھے پکارو تو وہ جو بندے کی رگِ جاں سے قریب ہے، وہ کیا بندے کی پکار نہیں سنتا؟ یقیناً وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور خاص طور پر گناہ گار انسانوں کو تو اللہ تعالیٰ نے "یا عبادی" اے میرے بندو! کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض اللہ کے در پر ہونا ہی اتنی بڑی سعادت اور خوش بختی ہے کہ جسے صرف اور صرف اللہ کے در کی گدائی مل گئی، وہ دونوں جہانوں میں کامیاب ہو گیا، مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے ہر وقت پکارتے رہتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی التجائیں، ضروریات اور حاجات پیش کرتے رہتے ہیں، یوں ایک تو ہر وقت اُن کا اپنے اللہ سے تعلق رہتا اور دل مطمئن رہتا ہے اور قیامت والے دن اُن دعاؤں کا صلہ، جو دنیا میں بظاہر منظور نہیں ہوئیں، دیکھیں گے تو پکار اُٹھیں گے کہ اے کاش! ہماری دنیا میں کوئی دعا قبول نہ ہوتی۔ تمام افراد کا ادب واحترام کیجیے، عزت وتکریم سے پیش آیئے، مگر حاجات اور مشکلات میں صرف اپنے اللہ کو پکاریے، اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے:

غیر اللہ سے اُمیدِ نجات وابستہ کرنا خود فریبی ہے، عنایتِ خداوندی اور نیک اعمال کے بغیر اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سفارش کام نہیں آسکے گی۔ انبیاء علیہم السلام مخلوقِ خدا میں سب سے بڑے اور عظیم تھے، وہ معصوم تھے، وہ ایسے افراد تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُن کا انتخاب کیا تھا، مخلوق میں سے چنا اور رہتی دنیا تک اُن کا ذکرِ خیر باقی رکھا، اُنھیں سلام کیا،

درود بھیجتا ہے اور انتہائی احترام وعزت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ صرف نبی کی آواز سے آواز بلند ہونے کی پاداش میں سارے اعمال نماز، روزہ، زکوۃ، حج، جہاد غرض تمام نیکیاں ختم، اُن کے ہاتھوں سے ایسے ایسے معجزے دکھائے کہ دنیا ششدر اور عاجز رہ گئی مگر تمام تر عنایات، عزت واحترام، عظمت اور بزرگی کے، ہدایت جس کے لیے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا، اپنے ہاتھ میں رکھی اور تو اور انبیاء علیہم السلام کے قریبی اِس سے محروم رہ گئے۔ یاد کیجیے، جب نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لیے سفارش کی۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ۝ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ۝ ﴾ [1]

''اور جب پکارا نوح نے اپنے رب کو اور کہا، اے میرے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے، تو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ ارشاد ہوا، اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں وہ تو بد عمل ہے، پس ہم سے ایسی چیز کی درخواست نہ کر جس (کی حقیقت) کا تجھے علم نہیں۔ ہم تمھیں سمجھائے دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔''

اور سیّدنا ابراہیم علیہ السلام جو نہ صرف عظیم پیغمبر ہیں بلکہ پیغمبروں کے جدِ امجد ہیں، انھوں نے جب اللہ سے کہا:

﴿ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۝۱۲۴ ﴾ [2]

''جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا اور انھوں نے سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمھیں لوگوں کا امام بنا دوں گا، عرض

[1] هود: ١١/ ٤٥، ٤٦.
[2] البقرہ: ٢/ ١٢٤.

کرنے لگے اور میری اولاد کو بھی، اللہ نے فرمایا! میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں ہے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف، احسن البیان میں آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''میرا وعدہ ظالموں سے نہیں'' اس امر کی وضاحت فرمادی کہ ابراہیم علیہ السلام کی اتنی اونچی شان اور عنداللہ منزلت کے باوجود، اولادِ ابراہیم میں سے جو ناخلف اور ظالم ومشرک ہوں گے، ان کی شقاوت ومحرومی کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پیمبرزادگی کی جڑ کاٹ دی۔ اگر ایمان وعمل صالح نہیں، تو پیرزادگی اور صاحبزادگی کی بارگاہِ الٰہی میں کیا حیثیت ہوگی؟

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَن بَطَّأَبِهٖ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهُ .))

''جس کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اُس کا نسب اُسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔''[1]

بقول علامہ اقبال: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل شرط ہے مگر اسلام میں عملِ رسول ﷺ کی تخصیص کردی گئی لہٰذا ممکن ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے متعدد ذرائع ہوں مگر قربِ الٰہی کا ایک ہی ذریعہ ہے: فَاتَّبِعُوْنِي......

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

[1] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ والقرآن، ص۹۸.

محمد رسول اللہ ﷺ

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ ایمان بالرسالت ہے، ایک مسلمان کے لیے لازم ہے وہ ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے سیّدنا آدم علیہ السلام سے محمد ﷺ تک جتنے انبیاء بھیجے وہ سب برحق تھے اور اپنے اپنے اووار میں قابلِ اتباع تھے۔ محمد ﷺ کے بعد ظلّی یا بروزی کسی قسم کا کوئی نبی نہیں ہوسکتا کہ آپ خاتم النّبیین ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس بارے نہایت واضح دلائل ہیں اور اس عقیدہ پر تواتر سے اجماعِ اُمت چلا آرہا ہے کہ آج تک اُمتِ مسلمہ نے کسی بھی مدعیٔ نبوت کی نبوت کو اجتماعی سطح پر قبول نہیں کیا اور اجماع کا یہ دعویٰ اتنا قطعی الثبوت ہے کہ اس کی حقانیت کو نہ چیلنج کیا جاسکتا ہے، نہ ہی قرآن وحدیث کی طرح اس میں تاویل ممکن ہے، یہ الگ بات ہے کہ قرآن وحدیث سے بھی تاویلات یکسر باطل ہیں۔

ختم نبوت کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی نبوت ورسالت دائمی حیثیت رکھتی ہے، اس دائمی یا ابدی حیثیت کے لیے لازم تھا کہ محمد ﷺ کی تعلیمات بھی موجود ہوں کیونکہ جب کسی نئی ہدایت نے نہیں آنا تو پرانی ہدایت کا برقرار رہنا ضروری ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کردیا کہ ہمارے پاس نبی پاک ﷺ کی زندگی کا لمحہ لمحہ محفوظ ہے اور زندگی کا کوئی پہلو یا گوشہ ایسا نہیں جس میں ہمیں سیرتِ پاک سے رہنمائی نہ ملتی ہو۔

رسالتِ محمدی ﷺ کی ابدیت کو بعض لوگوں نے چیلنج کیا اور رہنمائی کے لیے صرف قرآن حکیم کو کافی قرار دیا اور سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ" [1] سے

---

[1] قطع نظر اس کے کہ کتاب کا لفظ آپ ﷺ کے فرمودات پر بھی بولا گیا، کیا یہ حقیقت نہیں کہ کتاب ہی آپ ﷺ کی اتباع کو لازم کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل دیکھیے کہ کیا وہ عبادات ومعاملات میں آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے فرمودات کو قبول نہیں کرتے ⇦⇦

استدلال کیا مگر یہ فکری رویہ غلط ہے اور اس پر بہت مباحث موجود ہیں، یہاں صرف اتنا واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر رسالتِ محمدیہ ﷺ میں ابدیت کا تصور نہ ہوتا تو مسلمانوں میں جمع وتدوین احادیث کا رویہ جنم ہی نہ لیتا، کیونکہ اگر ایک فرد محض اپنی ذاتی حیثیت سے یا حاکمِ وقت کی حیثیت سے اپنی حیاتِ فانی کو پورا کر جاتا ہے تو پھر اُس کا تذکرہ خیر یا بد تو ہوسکتا ہے مگر اُس کی ابدی اطاعت کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا، دنیا میں جس قدر عظیم لوگ یا پیغمبر آئے، آج اُن کی زندگی پردۂ اخفاء میں ہے اور اُن کو اس طرح قابلِ اتباع بھی خیال نہیں کیا جاتا سوائے مذاہب کے ماننے والوں کے۔ گو کہ مذاہب کے ماننے والوں کے پاس بھی اپنے پیغمبروں کے حالات موجود نہیں اور یہ تو صرف اور صرف محمد ﷺ ہیں جن کی زندگی اوّل تا آخر محفوظ ہے۔

قابل اتباع کون......

مطاعِ مطلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ مخلوق بھی اُسی کی ہے اور حکم بھی اُسی کا ہے۔ ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ [1]

چنانچہ مخلوق سے کوئی بھی دوسری ہستی خواہ وہ فرشتے ہوں، جن ہوں یا انسان، اطاعتِ غیر مشروط کا مطالبہ نہیں کرسکتے، وہ مخلوق کے پیدا کرنے والے نہیں، رزق دینے والے نہیں اور نہ ہی حفاظت ونگہبانی کرنے والے ہیں۔ لہٰذا مخلوق پر چونکہ اپنے وجود اور بقا کے لیے کسی کا کوئی ذرہ بھر بھی احسان نہیں، لہٰذا اطاعت بھی غیر اللہ کی نہیں۔

مگر وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے، اُس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں چنانچہ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اُس نے اُسے بے یارومددگار نہیں چھوڑ دیا اور پھر تخلیق کا مقصد بھی عبادت

⇐⇐ رہے۔ حدیث کو قبول کرنے کا معیار اُن کا سخت تھا مگر جب قولِ رسول ﷺ ثابت ہوگیا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُسے قبول کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''آئینہ پرویزیت، عبدالرحمان کیلانی''

[1] الاعراف: ٧/ ٥٤.

کے ذریعہ مخلوق کو نوازنا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مخلوق کو اپنی پسند وناپسند سے آگاہ کرتا تاکہ آزمائش کے لیے حجت تمام ہو سکے۔ اس نے اپنے پیامبر منتخب کیے اور مخلوق کی رہنمائی کے لیے پے در پے بھیجے، اتنے تسلسل سے رہنما فراہم کرنا بھی اُس کی رحمت کا تقاضا تھا کہ مخلوق کو انجامِ بد سے بچایا جائے، چناں چہ اپنے سفیروں کو اپنے اپنے ادوار میں اُس نے لوگوں کے لیے مطاع بنایا کہ اُن کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔ ہر دور کا نبی اپنی اُمت کے لیے ایک نمونہ اور مثال تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے انسان مطلوب ہیں، ہر نبی اپنی امت کا آئیڈیل ہوتا ہے اور افرادِ امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس آئیڈیل کے مطابق اپنا 'الٰہ' سے رابطہ استوار کریں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا تو کتاب کی بقا کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی اور ایسا بندوبست فرمایا کہ صاحبِ کتاب کی زندگی بھی محفوظ کر لی۔ اگر صاحبِ کتاب علیہ الصلوٰۃ وتسلیمات کی زندگی محفوظ نہ ہوتی تو پھر ان آیات کا مصداق کوئی نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ❶

''ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے، اللہ کے اذن سے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ❷

''جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔''

ایک اور جگہ پر فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ❸

''(اے نبی!) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے

❶ النساء: ٤/ ٦٤.
❷ النساء: ٤/ ٨٠.
❸ الفتح: ٤٨/ ١٠.

بیعت کرتے ہیں۔''

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اِس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معیارِ مطلوب، سیّدنا محمد ﷺ ہیں اور چونکہ قرآن حکیم کا یہ حکم دائمی ہے، لہٰذا نبی پاک ﷺ کی زندگی بطور نمونہ بھی دائمی ہے اور اس اسوۂ حسنہ کی ابدیت پر اجماعِ اُمت ہے۔

نبی کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں ایک اور رُخ سے بھی نبی کی ضرورت کو دیکھ لیں کہ بعض افراد کا محض قرآن حکیم کو کافی سمجھنا اور نبی پاک ﷺ کو اپنے دور کے بعد کتاب سے یوں الگ کر دینا جیسے (نعوذ باللہ) پیامبر یا ڈاکیہ خط دے کر چلا جاتا ہے اور خط کی وصول کے بعد ڈاکیہ سے ہمارا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اللہ کے لیے بادشاہوں وغیرہ کی مثالیں ڈھونڈنا اور سفارشی تلاش کر کے رسائی حاصل کرنے کے تصورات، اللہ تعالیٰ کی توہین ہیں، اسی طرح پیغمبر ﷺ کو دنیوی پیامبروں سے تشبیہ دینا ایک طرف تو آپ ﷺ کی توہین ہے۔ دوسرا خط اور ڈاکیہ کی مثال کتنی بے محل اور غلط ہے، آپ اندازہ کیجیے کہ کبھی بھی کسی کو ایسا خط ملا ہے یا ملے گا جس میں ڈاکیہ کے بارے میں لکھا ہو کہ تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس ڈاکیہ کی ہر ہر بات مانو، اس کی مکمل اتباع و پیروی کرو، اگر ذرا بھی تم اس ڈاکیہ کے مقابل اپنی مرضی سے کوئی کام کرو گے تو میں، مکتوب نگار، تم سے ناراض ہو جاؤں گا اور میں تمھیں تمام تر انعام و اکرام سے محروم کر دوں گا۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی بھی کسی بھی خط میں ڈاکیے کا سرے سے کوئی ذکر تک نہیں ہوتا اور کوئی بھی مکتوب الیہ، یہ سرے سے تصور نہیں کرتا کہ خط پہنچانے کے علاوہ بھی کوئی ڈاکیہ کا کام ہے۔ لیکن یہ خط (قرآن حکیم) اپنے پیامبر (محمد ﷺ) کا نہ صرف بار بار تذکرہ کرتا ہے بلکہ بقول قرآن کریم مطالبہ کرتا ہے کہ:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾ [1]

---

[1] الحشر: ۵۹/ ۷.

''اور رسول جو دیں اُسے لے لو، اور جس سے روک دیں، اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝۶۵﴾ [1]

''پس قسم ہے تمھارے رب کی! یہ ایمان والے نہیں ہوسکتے جب کہ تمام آپس کے اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس سے اپنے دل میں تنگی وناخوشی محسوس نہ کریں اور فرماں برداری سے تسلیم کرلیں۔''

نبی کی حیثیت واہمیت:

ایک جگہ یوں فرمایا:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [2]

''اور کسی مومن مرد اور عورت کو اللہ اور رسول کے فیصلے کے بعد کسی امر کا اختیار باقی نہیں رہتا۔''

مندرجہ بالا آیات اس بات میں کتنی واضح ہیں کہ نبی کے لیے مثالیں مت تلاش کرو، اُن کی منفرد اور ممتاز حیثیت، نوعِ انسانی کے لیے قیادت وسیادت کا معیار تو ہے مگر اُن کی مثل کوئی نہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم بھی نبی پاک ﷺ کے لیے کہتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۝۱۱۰﴾ [3]

''آپ کہہ دیجیے کہ میں تم جیسا ہی ایک انسان ہوں (ہاں) میری جانب وحی

[1] النساء: ٤/ ٦٥.
[2] الاحزاب: ٣٣/ ٣٦.
[3] الکھف: ١٨/ ١١٠.

کی جاتی ہے کہ سب کا معبود بس ایک ہی معبود ہے، پس جسے اپنے رب سے ملنے کی آرزو ہو، اُسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انبیاء، فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں بلکہ انسان ہیں اور نوعِ انسانی کے حوالے سے وہ تمھاری مثل ہیں نہ کہ مرتبہ و مقام کے اعتبار سے۔ انسان ہوتے ہوئے کسی دوسرے فرد کو یہ مرتبہ نہیں ملا کہ اُس کا درجہ، اللہ تعالیٰ کے بعد ہو یعنی بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ ہیرا بھی کاربن ہے اور کوئلہ بھی کاربن ہے۔ یعنی کاربن ہونے کی حیثیت سے ہیرا اور کوئلہ یکساں ہیں مگر قدر و قیمت اور مرتبہ و مقام کے لحاظ سے کوئلہ اور ہیرا میں کوئی مقابلہ نہیں، یہی نبی اور عام انسانوں کے درمیان مماثلت اور تفاوت ہے۔

سیّدنا محمد ﷺ کی منفرد اور ممتاز حیثیت کا تعین کرنے کے بعد قرآن حکیم ہی اُن کے مطاع ہونے یعنی قابلِ اتباع و اطاعت ہونے کی اطلاع دیتا ہے اور یہ صرف ایسی اطلاع نہیں کہ سن لی اور بس، بلکہ اس حیثیت کو وہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کا دارومدار قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾﴾ ❶

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ ❷

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔''

ایک مقام پر فرمایا:

---

❶ محمد :٤٧/ ٣٣ .
❷ النساء : ٤/ ٨٠ .

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ❶

''اے محمد! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اطاعتِ رسول ﷺ کی فرضیت مندرجہ بالا آیات سے واضح ہے اور اعمال کی قبولیت کا دارومدار اسی اطاعت پر رکھا گیا ہے۔ اطاعتِ رسول ہی دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے کہ رسول اپنی اطاعت کا حکم اپنی مرضی سے نہیں دیتا بلکہ اللہ تعالیٰ رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ❷

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اللہ کے حکم سے۔''

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کی اطاعت سے انحراف کے نتیجہ میں دنیا میں انسانوں پر گرفت نہیں ہوتی یا اُن پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ، اس لیے کہ دنیا دارالامتحان ہے اور آخرت دارالجزاء، چنانچہ اطاعتِ رسول سے انحراف کی سزا بھی اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ہی دے گا اور اب کوئی کہے کہ اطاعتِ رسول کے منکر یا باغی کو ہم دیکھتے ہیں کہ سزا نہیں مل رہی یا اُس پر عذابِ الٰہی نہیں آ رہا۔ یہ سوچ اسلام کے فکری نظام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مشرکین بقول قرآن کریم کہتے تھے کہ:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۵﴾ ❸

''یہ وعدہ (عذاب کا) کب پورا ہوگا؟ اگر تم سچے ہو''

اور سورہ الانفال آیت ۳۲ میں تو کہتے ہیں ''خدایا! اگر یہ (قرآن) واقعی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔''

❶ آل عمران: ۳/ ۳۱.
❷ النساء: ٤/ ٦٤.
❸ الملك: ٦٧/ ٢٥.

اطاعتِ رسول واقعات کی روشنی میں:

اطاعتِ رسول ﷺ میں سب سے اہم بات اِس کی غیر مشروطیت ہے۔ مخلوق میں سے انبیاء ہی وہ واحد مقدس گروہ ہے جن کی اطاعت میں کسی چوں چرا کی گنجائش نہیں، نبی کو کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات میں کیوں مانوں؟ انبیاء کے علاوہ بڑے سے بڑے انسان کی یہ حیثیت نہیں۔ کوئی بھی انسان صرف اُس وقت قابلِ اطاعت ہوگا جب وہ رسول کی بات کے مطابق ہوگا۔ اِسی بات کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں واضح طور پر بیان کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جب تک میں اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اوراس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔"

یاد رہے کہ جو کہا جاتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا احادیث کا مجموعہ جلایا، غلط ہے۔ [1]

یہ عجیب بات ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ بات قولاً کہی بلکہ عملاً یہ سب کچھ کرکے دکھا بھی دیا، چنانچہ جب آپ ﷺ فوت ہوگئے اور زمامِ اقتدار سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی تو مدینہ کے اطراف واکناف میں بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور صحابہ متفرق ہوگئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اس معاملہ میں متردد تھے، یہاں تک کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے نرمی کی درخواست کی اور سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم جاہلیت میں سختی کرنے والے اور اسلام میں سستی کرنے والے بن گئے اور سیّدنا مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی اِسی قسم کا سوال جواب ہوا، سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ابتدا) میں تمام صحابہ مانعین زکوۃ سے لڑنے کو بُرا سمجھتے اور کہتے تھے کہ وہ اہلِ قبلہ ہیں، مگر جب سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار زیبِ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: الحدیث (حضرو شمارہ 97 اگست 2012ء)۔

دوش کی اور تنہا چلے تو پھر سب نے جانے کے سوا کوئی مفر نہ دیکھا (اور کہا یا خلیفۃ الرسول! آپ بیٹھیے ہم جاتے ہیں) سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم ابتداء میں اُس (لڑائی) کو بُرا سمجھتے تھے مگر آخر میں ہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس معاملہ میں شکرگزاری کی، یہ دونوں روایتیں بغوی وغیرہ نے لکھی ہیں۔" [1]

اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بٹ گئے اور آراء میں شدید اختلاف رونما ہوا، حد یہ ہے کہ آخر کار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ لشکر بھیجنے سے باز نہیں آتے، اس حالت میں کہ مدینہ کے حالات انتہائی ناسازگار ہیں تو کم از کم اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو تو لشکر کی سربراہی سے ہٹادیں جو ایک غلام زادہ ہیں اور اُن کی ماتحتی میں قریشی سردار ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے یقین ہو کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے تو بھی اسامہ کے اس لشکر کو روانہ ہونے سے نہ روکوں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ اگر مدینہ میں میرے سوا کوئی بھی باقی نہ رہے تو بھی میں اس لشکر کو ضرور روانہ کروں گا۔" [2]

یہ وہ قوتِ ایمانی اور محبتِ رسول ﷺ اور فہمِ اسلام ہے جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں ملے گی، چنانچہ بات امیر المؤمنین خلیفہ بلافصل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چلی اور ایک اور نظیر قائم ہوئی کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف آ جائے تو سب کی رائے نہیں چلے گی بلکہ عمل صرف اور صرف اُس رائے پر کیا جائے گا جو نبی ﷺ کی بات کے مطابق ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی دوسری روایت میں آتا ہے:

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلاصۃ الخلفاء؛ ص۱۳۸، ۱۳۹۔

[2] طبری، ج۳ بحوالہ:احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، مولانا محمد تقی امین، ص۱۵۳۔

"اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیے مدینہ میں داخل ہوکر مجھے اٹھالیں جائیں تو بھی وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جیسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔" ❶

حجیت حدیث اور اجماع صحابہ:

گویا اجماع کی بنیاد کثرت نہیں صحتِ فکر ونظر ہے تاہم کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم میں کمزوری اور نیت میں فرق لازم آتا ہے، صحابہ کرام علم وفضل میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا اور جب بات اُن کی سمجھ میں آ گئی تو تمام نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطاعت وفرماں برداری کی اور اتحاد کی رحمت اُن پر چھا گئی۔

اسی اختلاف سے پھر یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ صحابہ کرام کو حجیت حدیث میں ذرا بھر تامل نہ تھا۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ یا حاکمِ وقت کے اُن تمام باتوں کو نافذ کرنے پر اصرار نہیں کیا کہ میری باتیں اس لیے قابلِ قبول ہیں کہ میں حاکمِ وقت ہوں، انھوں نے اپنے عمل کے لیے عملِ رسول ﷺ کو معیار بنایا اور ریاستی امور میں بھی اُن کاموں سے انحراف نہیں کیا جو نبی پاک ﷺ کے حکم کے مطابق تھے، سیّدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی تقرری کا مسئلہ تعبدی امور میں سے نہ تھا، بلکہ بذاتِ خود لشکر کی روانگی کا بھی تعبدی امور سے تعلق نہ تھا، مگر سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے تمام امور پر خواہ وہ عبادت سے متعلق تھے یا ریاستی امور سے، اطاعتِ رسول ﷺ کو پیشِ نظر رکھا، گویا زندگی ایک ایسی اکائی ہے جس میں کوئی ایسی تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی کہ کچھ امور تو دینی ہوں اور کچھ میں مرضی کا دخل ہو، آپ ﷺ کا تابیرِ نخل میں یہ فرمانا کہ تم دنیا کہ امور بہتر سمجھتے ہو، کا تعلق محض فنی یا پیشہ وارانہ مہارتوں سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انبیاء فنی یا پیشہ وارانہ مہارتوں کے سکھانے کے لیے مبعوث نہیں ہوتے، ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنے والے اپنے شعبہ میں ماہر ہوتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی شعبۂ علم وفن میں بھی اللہ اور رسول کے حکموں سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً کوئی یہ نہیں کرسکتا کہ وہ حرام اشیا کی تجارت کو اپنا حق سمجھے یا

❶ ایضاً، ص ١٥٤.

اپنے کام کو دیانت داری سے سرانجام نہ دے۔ غرض تمام زندگی مکمل طور پر اللہ اور رسول کی اطاعت میں بسر ہوگی اور یہ مطلب ہے "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً" کا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' اور یہی مطلب ہے آپ ﷺ کا فرمان کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص بھی ایمان دار نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہشات تابع ہو جائیں اس شریعت کے جو میں لایا ہوں۔''❶، ❷

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اطاعتِ رسول کے اس رویہ سے، جب کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن کی رائے کے مخالف تھے، علامہ ابن القیم کی وہ بات درست ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ تنہا، ایک آدمی اجماع ہے اگر وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ وہ لکھتے ہیں ''یقین مانو کہ اجماع، حجت، دلیل، سوادِ اعظم سب کچھ محقق عالم ہی ہے اگرچہ وہ اکیلا ہی ہو۔''

ابن القیم لکھتے ہیں:

''حضرت عمر بن میموں اودی کہتے ہیں کہ میں سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا، یمن میں پھر شام میں یہاں تک کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ میں آپ سے جدا نہیں ہوا۔ آپ کے وصال کے بعد سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا۔ آپ سب سے زیادہ فقیہ تھے، میں نے اُن سے سنا ہے فرماتے تھے جماعت کو لازم پکڑو اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے، پھر ایک روز میں نے آپ سے سنا، فرماتے تھے تم پر ایسے والی آئیں گے جو نمازوں کو وقتوں سے مؤخر کریں گے، پس تم ہر نماز کو اُس کے وقت پر پڑھا کرو وہی تمھاری فرض نماز ہے۔ پھر اُن کے ساتھ بھی مل جایا کرو یہ تمھاری نفل نماز ہو جائے گی۔ میں نے کہا: ''آپ ہی نے تو رغبتیں دلائیں کہ جماعت کو لازم پکڑو پھر آپ ہی

❶ حافظ زبیر علی زئی کے نزدیک اِس کی سند ضعیف ہے۔

❷ مشکوۃ جلد اول کتاب الاعتقاد، ص ۳۰۔

فرماتے ہیں کہ جماعت سے الگ اپنی فرض نماز ادا کرلیا کرو اور جماعت میں نفل پڑھو؟'' یہ سن کر سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں تو تمھیں اس شہر کے لوگوں سے سمجھ دار گمان کرتا تھا، تم جانتے بھی ہو کہ جماعت کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا، آپ نے فرمایا: ''جماعت وہ نہیں ہے جو جماعت سے جدا ہوگئی ہو، جماعت وہ ہے جو حق کے موافق ہو خواہ تم اکیلے ہی کیوں نہ ہو۔ اور روایت میں ہے کہ سیّدنا عبداللہ نے میری رانوں پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''افسوس جمہور السان جماعت سے جدا ہوتے ہیں، جماعت انھیں کو کہتے ہیں جو مطابق طاعتِ خدا ہوں۔'' حضرت نعیم بن حماز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب جماعت میں بگاڑ پیدا ہوجائے تو اس سے پہلے جس حق پر وہ تھی تو اُسی پر قائم ہوجا، اگرچہ تو تنہا ہی رہ جائے۔ ایسے وقت تو اکیلا ہی جماعت ہے۔'' یہ دونوں اثر سنن بیہقی وغیرہ میں موجود ہیں۔'' ❶

دلیل میں وہ امام احمد حنبل رحمہ اللہ کی مثال لائے ہیں، کافی تفصیلی بحث موجود ہے مگر مختصر پیش خدمت ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہمیں کہنے دیجیے کہ حق امام احمد رحمہ اللہ کے ساتھ تھا وہ تن تنہا جماعت تھے۔'' ❷

نبی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں:

اس ساری بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر نبی کی رائے یا بات صرف اُسی وقت قابلِ قبول ہوگی جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی بات کے مطابق ہوگی۔ اس بات میں کوئی دوسری رائے امتِ مسلمہ میں نہیں پائی جاتی سوائے چند ایک معتزلی فکر کے حامل افراد کے۔ تیسری اطاعت، اطاعت اولوالامر کی ہے، اولوالامر سے مراد مختلف مفسرین نے مختلف لی ہے تاہم اس سے کوئی بھی مراد ہو یعنی حاکمِ وقت، فقہاء و محدثین یا کسی بھی شعبۂ علم وفن

❶ اعلام الموقعین، جلد پنجم، ص ۳۷-۱۱۳٦ .

❷ ایضاً، ص ۱۱۳۷ .

میں حاکمانہ حیثیت رکھنے والے افراد، اُن سب کی اطاعت اُسی وقت کی جائے گی جب وہ اطاعتیں اللہ اور رسول کی اطاعت کے ماتحت ہو گی ،قرآن حکیم نے جہاں اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، وہاں یہ بات نہایت واضح کردی ہے کہ تنازعات میں فیصلہ اللہ اور رسول ﷺ کا مانا جائے گا اور اس رجوع سے اب مراد قرآن و حدیث کی جانب رجوع مراد ہوگا، فرمانِ خداوندی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ ❶

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی (اطاعت کرو) جو تم میں سے ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی بات میں تنازعہ ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔“

اور اس سلسلہ میں فرمانِ رسول ﷺ بھی نہایت واضح ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ .)) (بخاری)

”اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف (نیکی) میں ہے۔“

رسول کی اطاعت غیر مشروط:

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت غیر مشروط ہے اور قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ حدیثِ رسول ﷺ اگر معیار مطلوب تک پہنچتی ہے اور صحت کی حامل ہے تو اس کی اطاعت اُسی طرح ضروری ہے جیسے قرآن حکیم کی، اور یہ بات خود قرآن حکیم ہی سے واضح ہوتی ہے کہ محض قرآن حکیم پہنچا دینا آپ ﷺ کا فریضہ نہ تھا بلکہ اس کے معانی و مفاہیم کا بیان بھی آپ ﷺ کا فریضہ تھا۔ قرآن

❶ النساء: ٤/ ٥٩ .

حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿١٦﴾ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾﴾ ❶

''اے نبی! اس وحی کو یاد کرنے کے لیے جلدی جلدی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں، اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔''

اجتہاد کب اور کیونکر......؟

اب چونکہ قرآن حکیم مکمل ہو چکا اور ختم نبوت کی وجہ سے اب کسی نئے نبی کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں اور مسائل لامتناہی ہیں چنانچہ ''اجتہاد'' ایک ناگزیر امر ہے۔ اجتہاد دراصل قرآن وحدیث کا تسلسل یا معنوی تسلسل ہے کیونکہ یہ بات اصول کے طور پر قبول کی جاچکی ہے کہ نص کے مقابل اجتہاد نہیں ،فرد یا ارادے کا اجتہاد (یارائے) اپنے اندر وہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کا انکار ممکن نہ ہو، سوائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے جس پر وہ مجتمع ہوگئے ہوں۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثال کو ہی سامنے رکھیے کہ جب تک اختلاف تھا۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے انکار کے لیے وہ دلائل رکھتے تھے مثلاً فاروق اعظم رضی اللہ عنہ:

''آپ ان لوگوں سے کیسے قتال کریں گے جب کہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ''لا الہ الا اللہ'' کہنے تک قتال کریں،جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا اُس نے اپنی جان ومال کی حفاظت کرلی اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگیا، ہاں اگر اسلام کا کوئی حق ہوتو وہ اور بات ہے۔'' ❷

---

❶ القیمۃ: ٧٥/١٦-١٩.

❷ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، مولانا محمد تقی امینی، ص ١٦٨۔

لیکن سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی اس دلیل کو قبول نہ کیا اور کہا:

"خدا کی قسم اس شخص سے ضرور جہاد کروں گا جس نے نماز اور زکوۃ میں تفریق کی کیونکہ زکوۃ مال کا حق ہے۔" ❶

تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی دلیل اور دوسرے معاملات میں بھی آپ کے دلائل قبول کر لیے۔ اب جبکہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے یا بہتر الفاظ میں یا قرآن وحدیث کی تعبیر کو قبولِ عام حاصل ہو گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھ لیا کہ حق سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبان پر بول رہا ہے، تو پھر صحابہ کا اجماع ہو گیا، ایسے اجماع کی صحت پر بھی امت کا اتفاق ہے۔

اجماع کی صحت پر سوائے معتزلہ اور شیعہ کے کسی کا اعتراض نہیں اور اہلِ تشیع بھی اہلِ بیت کے اجماع کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ جو علامہ اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں لکھا ہے:

"لیکن فرض کیجیے صحابہ کسی امر پر متفق ہیں، اندریں صورت سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے فیصلے کی پابندی کیا ہمارے لیے بھی ضروری ہے؟ شوکانی نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مذاہب اربعہ نے اس کے متعلق رائیں قائم کی ہیں۔ ان سب کا ذکر بھی کر دیا ہے، میری رائے میں اس مسئلے کا فیصلہ یوں ہونا چاہیے کہ ہم ایک امرِ واقعی اور امرِ قانونی میں فرق کریں، مثلاً اس مسئلے میں کہ آخری دو سورتیں معوذتان قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں؟ اور جن کے متعلق صحابہ کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ یہ دو سورتیں جزوِ قرآن ہیں۔ ہمارے لیے ان کا اجماع حجت ہے۔ کیونکہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس امرِ واقعی کو ٹھیک ٹھیک جانتے تھے بصورتِ دیگر یہ مسئلہ تعبیر و ترجمانی کا ہوگا۔ لہٰذا ہم کرخی کی سند پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں صحابہ کا اجماع ہمارے

❶ ایضاً، ص ۱۶۱۔

لیے حجت نہیں۔ کرخی کہتا ہے کہ صحابہ کا طریق انہیں باتوں میں حجت ہے جن میں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے ان میں ہم اسے حجت نہیں ٹھہرائیں گے۔'' ❶

اجماع صحابہ کے بارے میں مندرجہ بالا رائے درست نہیں۔ کرخی کی سند سے جو بات کہی گئی ہے یہ دراصل قولِ صحابی کے بارے میں ہے، فقہ حنفی میں دومکاتبِ فکر ہیں۔ ابوسعید بردعی کہتے ہیں کہ ''قولِ صحابی'' موافق قیاس ہو یا مخالف قیاس، ہر دوصورتوں میں حجت ہے۔ جبکہ ابوالحسن کرخی کی رائے ہے کہ ''قولِ صحابی'' مدرک بالقیاس ہونے کی صورت میں قابلِ حجت نہیں ہوگا صرف مخالف قیاس ہونے کی صورت میں حجت ہوگا۔ مجتہدین و علماء کے یہاں تفصیلی مباحث موجود ہیں ۔ابوالحسن کرخی کی رائے صاحب'' التوضیح'' کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''امام کرخی کے نزدیک ان مسائل میں تقلیدِ صحابی واجب ہے جو قیاس کے ساتھ موافق نہ ہوں کیونکہ ان میں قول صحابی کے لیے کوئی وجہ نہیں بجز سماع کے یا پھر جھوٹ کے اور جھوٹ تو ممکن نہیں لہٰذا یہ قول مسموع ہی ہوگا اور اُن مسائل میں یہ تقلید واجب نہیں جو عقل اور قیاس کے موافق ہوں۔ کیونکہ قول بالرائے اُن سے مشہور ہے اور مجتہد کبھی معیّب ہوتا ہے اور کبھی مخطی۔'' ❷

یہاں صرف اتنا واضح کرنا ضروری ہے کہ ''اجماع صحابہ'' کی حجیت پر چاروں فقہاء اور اہل حدیث کا اتفاق ہے۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

''ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا اجماع قابلِ عمل ہونے میں علمائے اہل سنت میں سے کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ کسی ایک صحابی کے فتوے کا واجب الاتباع ہونا اوراُسے قیاس یا دوسرے فتووں پر ترجیح دینا

❶ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۷۰۔۲۶۹۔

❷ التواضیح بحوالہ :مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ، مولانا محمد یوسف، ص ۲۷۸۔

مختلف فیہ ہے۔"[1]

امت کا سنت سے رابطہ ٹوٹ گیا؟

اطاعتِ رسول ﷺ کی غیر مشروطیت پر تو سوائے معتزلی فکر کے کسی کو اعتراض نہیں تاہم ہمارے یہاں جس طرح اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے وسیلے کا تصور در آیا ہے اور عملاً وسیلہ کے ساتھ وہی وابستگی ہوجاتی ہے جو اللہ سے ہونی چاہیے، اسی طرح اطاعتِ رسول ﷺ میں بھی درمیانی ذرائع یا وسیلے قائم کر لیے گئے ہیں اور اب اگر کوئی شخص براہِ راست اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کی بات کرے تو اسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد تقلیدِ شخصی کی ایسی رُو چلی جس نے نبی ﷺ سے رابطہ کے علمی رشتے کو منقطع کر دیا اور قرآن وحدیث سے عملاً امت کا رابطہ ختم کر دیا گیا اور فقہی روابط کی مطلقیت قائم کر دی گئی۔ جب کہ خود فقہی مکاتیبِ فکر میں ارتقاء یا تدریج اس بات پر دال ہے کہ قرآن وحدیث کی کسی ایک تعبیر کو اُمتِ مسلمہ نے قبول نہیں کیا، نیز ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے جو وسیلوں کے بغیر قرآن وحدیث سے رجوع کرتے رہے۔ فقہی تعبیر کی مطلقیت اور دائمیت پر اصرار کرنے والے کبھی اس خیال سے آشنا نہ ہوئے کہ اگر تخلیقی سطح پر قرآن وحدیث سے روابط ممکن نہیں اور چوتھی صدی ہجری ہی میں جب اجتہاد کے دروازے بند ہو گئے تھے تو پھر عملاً قرآن وحدیث کی زمانی یا عصری اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ یہ محض خوشنما یا مقدس الفاظ ہیں جن میں کاغذ کے پھولوں کی طرح خوب صورتی تو ہے، لیکن خوشبو اور مہک نہیں۔ نام نہاد علمی سطح کے حامل افراد پندرہ علوم کو قرآن کی تفسیر کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں بلکہ ایک پیر صاحب کے پمفلٹ میں تو قاری کے لیے بھی ان علوم کا جاننا ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ واضح طور پر آج قرآن وحدیث سے ہمارا رابطہ تخلیقی سطح پر منقطع ہے اور یہی وجہ ہے کہ زمانی تسلسل میں امتِ مسلمہ اپنی تخلیقی وعلمی شناخت سے محروم ہوچکی ہے۔

---

[1] فلسفہ شریعت اسلام، ص ۱۵۶۔

شاہ ولی اللہ نے تو اس رجحان کو ''تحریفِ دین'' کے عظیم ترین اسباب میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کورانہ تقلید تحریفِ دین کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے: مِن جملہ اسبابِ تحریف کے غیر معصوم ہستی کی تقلید کرنا ہے۔ غیر معصوم سے میری مراد ہر ایک ایسا شخص ہے جو نبی نہ ہو، جس کی عصمت ثابت ہو چکی ہے۔ تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ اُمت کا ایک عالم مجتہد اجتہاد کر کے کوئی مسئلہ بتاتا ہے تو اس کے متبعین اس کو اس حد تک صحیح سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے خلاف اگر کوئی صحیح حدیث بھی پیش کی جائے تو امام کے قول کی خاطر ان کے لیے اس حدیث کا رَد کر دینا نہایت آسان ہوتا ہے جس کی تقلید کو علمائے اُمت نے جائز قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی (جاہل اور بے علم ہونے کی بنا پر) کسی عالم مجتہد کے قول کی اتباع کرے لیکن ساتھ ہی اس کا یہ مستحکم عقیدہ ہو کہ وہ ایک غیر معصوم انسان ہے اور اس لیے اس کا قول غلط بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ علماء کا یہ متفق علیہ قول ہے (اور عقائد کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے) کہ: اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ: ''مجتہد کا قول کبھی غلط ہوتا ہے اور کبھی درست ہوتا ہے۔'' ایسے مقلّد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہے کہ اگر کسی مسئلہ میں اس کو اپنے امام کے قول کے خلاف کوئی بات مل جائے تو وہ فوراً اس کو ترک کر کے حدیث کا اتباع کرے گا۔ رسولِ خدا ﷺ سے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے متعلق: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''انھوں نے (یہود و نصاریٰ نے) خدائے بزرگ و برتر کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا رکھا تھا۔'' یہ شبہ ظاہر کیا کہ وہ تو اُن کو خدا نہیں سمجھتے تھے! تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''کیا وہ ان کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟'' عدی رضی اللہ عنہ نے کہا ''کیوں نہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا بنا لینے

کے یہی معنے ہیں۔"❶

تقلید شخصی کے نقصانات:

تقلید شخصی، بلاشبہ قرآن وحدیث سے براہِ راست استفادہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، ایسے افراد جو اس وسیلہ سے انکار کرتے ہیں اُنھیں لا مذہب اور غیر مقلد ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے، حالانکہ تمام علماء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری تک اُمتِ مسلمہ کا عمومی رویہ یہ تھا کہ بلاتخصیص، کسی بھی عالمِ دین سے قرآن وحدیث کا مسئلہ پوچھ کر اُس پر عمل کرتے تھے اور ایک عامی کے لیے درست طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ سوال کرے، اور یہ سوال کرے کہ اس مسئلہ میں اللہ اور رسول ﷺ کا کیا حکم ہے؟ وہ پابند بھی انہیں دونوں کا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ کسی غیر نبی کے حوالہ سے پوچھتا ہے کہ اس مسئلہ میں مثلاً امام ابوحنیفہ یا امام شافعی رحمہ اللہ کا کیا حکم ہے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ تخصیص کیسے قائم کی اور عامی ہو کر تم نے ایک امام کو دوسرے اماموں پر کیونکر ترجیح دی؟ کیونکہ ترجیح قائم کرنے کے لیے لازمی ہے کہ مثلاً چاروں اماموں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ دلائل کس کے قوی ہیں؟ اب اگر عامی میں اتنی قوت ہو تو وہ عامی نہیں رہتا، مجتہد ہوگا اور مجتہد کے لیے تقلید ویسے منع ہے، اور اگر وہ عامی ہے تو کسی امام کو چن نہیں سکتا لہٰذا ہر امام یا مجتہد اس کا امام ہے، لہٰذا کسی سے بھی مسئلہ پوچھ کر وہ عمل کرے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اگر اُسے پتا چل جائے کہ یہ مسئلہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے تو پھر اُسے چھوڑ دے اور اصل پر عمل کرے، عامی کے لیے اس طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے۔

تقلید کا دائرہ کار:

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

> "محققین کے نزدیک عامی کے لیے کوئی مذہب معین نہیں...... اس سے معلوم ہوا کہ عامی کا سوائے اس کے اور کوئی مذہب نہیں کہ جس عالم سے مسئلہ پوچھ

---

❶ حجۃ اللہ البالغہ، حصہ اول، ص ۵۸۰۔

لے، اس کے فتوے پر عمل کرے۔ اسی طرح بحرالرائق کے باب قضاء الفوائت میں لکھا ہے کہ اگر وہ عامی ہو جس کا کوئی مذہب معین نہیں تو اس کا مذہب یہ ہے کہ فتوے دینے والوں کے فتوے کی اتباع کرے، فقہا نے اس کی تصریح کی ہے۔ مثلاً اگر اس نے حنفی عالم سے پوچھا اور اُس نے عصر ومغرب کے اعادہ کرنے کا حکم سنایا تو وہ اُن نمازوں کو دوبارہ پڑھے اور اگر اُس کے مفتی شافعی مذہب ہے اور اُس نے کہہ دیا کہ تم پر اعادہ نہیں ہے تو اُس پر اعادہ نہیں ہے، بہرحال اس کی اپنی رائے کا کچھ اعتبار نہیں اور اگر اُس نے کسی سے استفسار نہیں کیا یا اتفاقاً اس کا عمل کسی مجتہد کے قول کے مطابق ثابت ہوا تو اسی کی نماز جائز ہے اور اس پر اعادہ لازم نہیں۔"[1]

اب اگر اس اختلاف کو دیکھ کر عامی کے ذہن میں خیال پیدا ہو کہ میں کیوں نہ کسی ایسے عالم سے پوچھ لوں جو براہِ راست حدیثِ رسول کا اتباع کا دعوے دار ہے تو اُس کے اس عمل کو نہایت مستحسن خیال کرنا چاہیے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کی بات کو جاننا چاہتا ہے اور چونکہ احادیث کا ذخیرہ بہترین انداز میں مدوّن ہو چکا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ احادیثِ صحیحہ کا علم ہو جانے کے بعد کسی ایک طرف تیقن حاصل کر لے۔ یوں عمل بالحدیث پر معترض ہونا الگ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایک فقہ کے حامل فرد کو بھی، جب کوئی عالم مسئلہ بتاتا ہے تو وہ بھی مجبور ہوتا ہے کہ ترجیح قائم کرنے کے لیے قرآن وحدیث کا سہارا لے اور یہ بات صرف بین الفقہا ہی نہیں بلکہ ایک ہی فقہ میں بھی اس قدر اختلافات ہیں کہ قرآن وحدیث سے رجوع لائے بغیر کسی ایک فقہ پر بھی عمل کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً حجۃ اللہ البالغہ ہی سے دو ایک مثالیں دیکھیں، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"......تاہم اُس (عامی) نے حدیث پر عمل کیا۔ اس صورت میں بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے مطابق اس پر کفارہ نہیں ہے کیونکہ ظاہر

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۵-۲۰۴۔

حدیث پر عمل کرنا واجب ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو اس قول سے اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک عام آدمی کو عمل بالحدیث کا حق حاصل نہیں، وہ تو ناسخ ومنسوخ تک کا علم نہیں رکھتا۔" (ص۲۰۴)

اسی نوعیت کی ایک مثال قدوری کی کتاب الصلوٰۃ باب صلوۃ الاستسقاء سے ملاحظہ ہو:

"امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "استسقاء (بارش کے لیے نماز) میں نماز باجماعت مسنون نہیں اور لوگ اگر اکیلے اکیلے نماز پڑھیں تو جائز ہے اور استسقاء تو صرف دعا ہے اور استغفار ہے۔" اور صاحبینؒ نے کہا کہ امام دو رکعت پڑھالے جن میں قرأت بآواز بلند کرے، پھر خطبہ دے اور قبلہ رُخ ہوکر دعا مانگے اور امام اپنی چادر الٹ دے لیکن لوگ اپنی چادریں نہ اُلٹائیں اور ذمی لوگ نماز استسقاء میں حاضر نہ ہوں۔"

امام اعظم اور صاحبین کے درمیان اختلاف:

اس نوعیت کے اختلافات کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ تقریباً دو ثلث، (دو تہائی تقریباً ستر فیصد) مسائل پر استاد اور شاگردوں کا اختلاف ہے، یہ اختلاف ظاہر ہے قابلِ عمل نہیں چنانچہ کسی ایک قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے جسے مفتیٰ بہ کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ دینے والا شخص بعد کے زمانے کا ہوگا، جو یہ دیکھے گا کہ اُستاد یا شاگردوں میں سے کس کا قول قرآن وحدیث کے قریب ہے؟ اب اگر وہ متعصب یا غالی مقلد نہ ہوگا تو لازماً وہ ایسا فتویٰ دے گا جو خواہ اُس کے مذاہب کے خلاف بھی پڑے تو پروا نہیں کرے گا کیونکہ اُس کا منشا اللہ اور رسول ﷺ کی اتباع واطاعت ہے اور ایسے مقلد پر خواہ وہ عالم ہو یا عامی، طعن جائز نہ ہوگا کیونکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ اصل اتباع اللہ اور رسول ﷺ کا ہے اور جب بھی قولِ امام، قرآن وحدیث سے متصادم ہوگا تو ترک کردیا جائے گا۔ خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں نے اسی روش کو اختیار کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس قدر شدید

❶ حجۃ اللہ البالغۃ، ص۵۔۲۰۴۔

اختلافات کا باعث بنی اور نہ صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بلکہ اہل سنت کے باقی تین اماموں کے نزدیک بھی حق یہی ہے کہ اُن کا جو قول حدیثِ رسول اکرم ﷺ سے ٹکرائے، دیوار پر مار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے رسول ﷺ کی اطاعت لازم کی ہے اور غیر مشروط طور پر لازم کی ہے تو پھر سوال بھی اِسی اطاعت کے بارے میں ہوگا۔ اب جو شخص بھی ایمان لاتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ میں صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کا پابند ہوں، اُن کے سوا جو بھی ہے، خواہ وہ امت کے سب سے بڑے افراد سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوں یا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یا کوئی امام ہو، استاد ہو، والد ہو یا کوئی بھی مقتدر شخص، رسول اکرم ﷺ کی اطاعت میں میرے لیے قابلِ قبول اور قابلِ اطاعت ہے۔

صحابہ، تقلیدی مذہب اور ائمہ کرام:

اور جیسا کہ کہا جاچکا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی روش تھی اور کوئی بھی غیر نبی نہ کلی طور پر حاملِ علوم نبویہ ہوسکتا ہے اور نہ مطلقاً قابلِ اتباع، اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”اے لوگو! میں ایک انسان ہوں، کبھی میری بات ٹھیک ہوتی ہے اور کبھی غلط، تم میری اُس بات کو لے لو جو کتاب وسنت کے مطابق ہو اور جو اس کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دو۔“

شاہ ولی اللہ، امام مالک کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

> ”دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں کہ اس کی تمام باتیں قبول کی جائیں سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔“ [1]

یہی بات دُرِ مختار کے حوالہ سے مندرجہ بالا کتاب میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حوالے

[1] بحوالہ حق کی تلاش، ارشاد اللہ مان، ص ٦٦، ٦٥، ٣٦٥۔

سے لکھی گئی ہے کہ:

"صحیح حدیث سے جو مسئلہ ثابت ہو جائے وہی میرا مذہب ہے۔ اگر تمھیں کوئی دلیل قرآن وحدیث میں مل جائے تو اسی پر عمل کرو اور اسی پر فتویٰ دیا کرو۔" [1]

اسی نوعیت کی روایات امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہیں، جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ائمہ کرام نے اپنے سر سے ذمہ داری کا بوجھ اُتار دیا، جب انھوں نے دلیل (قرآن وحدیث) سے رجوع کرنے کا کہہ دیا بلکہ آپ ذرا ابتدا میں دیکھیں تو سنت خلفاء راشدین پر عمل بھی حدیثِ رسول ﷺ سے ثابت ہے لیکن سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل دیکھیں کہ اختلافات کو قبول نہیں کیا بلکہ اپنی بات پر اصرار کیا اور منوایا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اللہ تعالیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے۔" [2]

خود اُن (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کا عمل بھی دیکھیں کہ قرآن حکیم کو مصحف کی شکل دینے میں متردد تھے مگر آخر کار "عمر رضی اللہ عنہ برابر مجھ سے اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ کھول دیا اور وہی بات مناسب سمجھی جس کو عمرؓ مناسب سمجھتے رہے۔" (ایضاً،ص۱۶۲)

اس ساری بحث سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نہ فقہاء کرام اور نہ امت کے کسی بزرگ یا رہنما نے اپنی اطاعت کو لازم قرار دیا اور نہ اپنی اطاعتِ غیر مشروط پر زور دیا ہے کیونکہ یہ صرف نبی ﷺ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص وہ نبی ﷺ کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا یا کسی وسیلہ کو لازم قرار دیتا ہے، خواہ وہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ ہی کا کیوں نہ ہو، تو وہ اپنے رویے میں درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ اطاعت کسی بھی غیر نبی کی غیر مشروط نہیں خواہ وہ فقیہ ہو یا محدث، اطاعت تو رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ اب اگر حدیث صحیح ہے تو بیان کرنے والا کوئی بھی ہو، قابلِ اتباع ہے۔ بخاری اور مسلم کو جو

---

[1] ایضاً،ص ۴۶۵۔

[2] ابوبکرؓ از محمد حسین ہیکل بحوالہ احکام شرعیہ حالات وزمانہ کی رعایت، مولانا محمد تقی، ص ۱۵۵۔

اُمت نے ترجیح دی ہے تو اُس میں یہی بات مضمر ہے کہ ہر دو حضرات نے انتہائی جانفشانی سے نہایت کڑے معیاروں کے تحت احادیثِ رسول ﷺ جمع کی ہیں۔یہی وجہ اُن کے قبولِ عام کی ہے مگر ایسی ضد کہ میں تو بخاری اور مسلم کے علاوہ کسی کو تسلیم نہیں کرتا، اطاعتِ بخاری و مسلم ہوگی نہ کہ اطاعتِ رسول ﷺ۔

تقلید اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا:

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حدیث سے رجوع کرنے والے افراد پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مولوی کی تقلید کرتے ہیں جس سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں۔حقیقت میں یہ بات تقلید کی تعریف سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔تقلید کے اصطلاحی معنی ہیں کسی غیر نبی کی بات کو دلیل (قرآن وحدیث) کے بغیر تسلیم کرلینا۔ابن ہمام حنفی نے لکھا ہے:

> ''تقلید اس شخص کے قول پر بغیر دلیل کے عمل کو کہتے ہیں جس کا قول (چار) دلائل میں سے نہیں ہے۔پس نبی ﷺ اور اجماع کی طرف رجوع تقلید نہیں ہے۔''❶

علی بن محمد علی الجرجانی حنفی (متوفی ۸۱۶ ھ) نے کہا:''تقلید عبارت ہے (رسول اللہ ﷺ کے علاوہ) غیر کے قول کو بغیر حجت وبغیر دلیل کے قبول کرنا۔'' (ایضاً،ص ۱۱)

قرآن وحدیث چونکہ دلیل یا حجت ہیں اس لیے اگر کوئی ان کا اتباع کرے یا اجماع کی طرف رجوع کرے تو اُسے مقلد نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ متبع (اتباع کرنے والا) کہلائے گا، دلیل (قرآن وحدیث) کی پیروی تقلید نہیں۔

ایک تقلیدی شبہ کا ازالہ:

اطاعتِ رسول ﷺ کے حوالے سے ایک اور بات جس کی وضاحت ضروری ہے اور جس نے حدیث سے رابطے منقطع کررکھے ہیں بعض لوگوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی ہے کہ احادیث میں بہت اختلافات ہیں لہٰذا ہر شخص براہِ راست اطاعت واتباعِ رسول ﷺ نہیں

❶ بحوالہ دین میں تقلید کا مسئلہ، حافظ زبیر علی زئی، ص ۱۰۔

کر سکتا۔ حقیقت میں یہ وہ زہریلا پروپاگنڈا ہے یا لوگوں کی غلط فہمی ہے جس نے اُمت کا نبی ﷺ سے رابطہ منقطع کر رکھا ہے۔ آپ ایسا کہنے والے سے سوال کریں کہ کیا تمھیں علم ہے کہ فقہ میں اختلاف کی کیا نوعیت ہے؟ اگر اُسے معلوم نہیں تو بتایئے کہ تقریباً ستر فیصد مسائل پر امام ابو حنیفہؒ اور شاگردوں میں اختلاف ہے اور اکثر مسائل پر شاگردوں کی رائے تسلیم کی جاتی ہے اور یہ فیصلہ بعد والے لوگ کرتے ہیں، اتنے زیادہ اختلافات کے بعد کیا فقہ سے رابطہ منقطع کر دیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کیا قرآن حکیم کے ترجمہ اور تفاسیر میں اختلافات نہیں ہیں؟ کیا اِن اختلافات کو بنیاد بنا کر ہم قرآن پاک سے رابطہ ختم کر دیں؟ نعوذ باللہ۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ رسول ﷺ میں اختلاف کی وہ نوعیت ہی نہیں، آپ غور کریں کہ کتنے لوگوں میں اہلیت ہے جو بخاری اور مسلم کی کتبِ حدیث پر اعتراض کر سکتے ہیں؟ خود صاحب ہدایہ نے ہر دو کی صحت پر اجماع نقل کیا ہے ہے۔ تاہم اگر آپ کسی پڑھے لکھے فرد سے بھی پتا کریں کہ اُس نے کبھی بخاری یا مسلم کا مطالعہ کیا ہے تو شاید ہی آپ کو اس کا جواب اثبات میں ملے۔ اب کوئی یہ بہانہ تو کر نہیں سکتا کہ وہ عربی نہیں جانتا، کیونکہ ہر زبان میں تراجم موجود ہیں اور حواشی نے اِن کی تفہیم کو مزید آسان کر دیا ہے بلکہ محدثین اور شارح خود بھی اپنی بیان کردہ روایت کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی فرد کے لیے کتبِ حدیث سے مسئلہ لینا آسان ہے بہ نسبت کسی دوسری کتاب کے اور اُس پر عمل کرنا اور بھی آسان ہے، یہ بات اُسی وقت سمجھ آ سکتی ہے جب آپ بخاری یا مسلم کو پڑھ کر دیکھیں، علامہ ابن القیم تو اِس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ بخاری یا مسلم کی موجودگی میں آپ فتویٰ دے سکتے ہیں، عمل کرنا تو ایک طرف رہا، اعلام الموقعین میں تفصیلی بحث موجود ہے، اُن کے خیال میں متاخرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ فتویٰ نہیں دے سکتا۔ ایک جماعت کہتی ہے:

فتویٰ اور عمل میں حدیث ہی قابل عمل کیوں؟

"کبھی حدیث منسوخ ہوتی، کبھی اس کے خلاف کوئی اور حدیث ہوتی ہے یا

اس کی دلالت سے وہ سمجھ لیا جاتا ہے جو اس کے خلاف ہوتا ہے۔ حکمِ جواز کے لیے ہے وجوب سمجھ لیا جاتا ہے...... عام اور حدیث میں مخصص (خاص) ...... یہاں مطلق ہو کسی اور جگہ مقید ہو۔۔۔ پھر نہ تو اس پر عمل جائز ہوگا نہ اس کے مطابق فتویٰ دینا جائز ہوگا، جب تک اہلِ فقہ اور اہلِ فتویٰ سے دریافت نہ کرلیا جائے...... دوسری جماعت کہتی ہے وہ اس پر عمل بھی کرسکتا ہے اور اس کے مطابق فتویٰ بھی دے سکتا ہے اور نہ صرف دے سکتا ہے بلکہ اس پر عمل کرنا اس کے مطابق فتویٰ دینا اس پر لازم ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ اِدھر صحابہ رضی اللہ عنہم کو کوئی حدیث پہنچتی، اُدھر وہ اس پر عمل شروع کردیتے، ایک دوسرے کو پہنچاتے، روایت کرتے، بیان کرتے، سنتے، سناتے، ایک سیکنڈ کا بھی وقفہ نہ کرتے، نہ اس کے معارضے تلاش کرتے، نہ اور کرید میں پڑتے، نہ کسی صحابی نے کبھی یہ کہا کہ فلاں نے بھی اِس پر عمل کیا؟ اگر ان کے سامنے کوئی ایسا سوال کردیتا تو یقیناً وہ اس سے بڑی سختی سے پیش آتے، یہی حال تابعین کا رہا اور یہ ایسی واضح حقیقت ہے کہ کوئی لاکھ چھپائے، نہیں چھپاسکتا۔ سنتوں اور حدیثوں کا پرانا ہوجانا، زمانۂ رسالت پناہ کا دور ہوجانا، یہ کوئی وہ چیز نہیں جو حدیثوں کو چھوڑ دینے اور دوسری چیز کو لے لینے کے جواز کی دلیل بن جائے۔ مسلمانو! خود ذرا سوچو کہ اگر تم نے صحیح حدیثوں پر عمل کرنے کے لیے بھی یہ شرط لگائی کہ فلاں یا فلاں نے عمل کیا ہو یا اُس کے مطابق فتویٰ دیا ہو تو اس پر عمل جائز ہے ورنہ نہیں، تو دراصل شارع تو وہ فلاں اور فلاں ہی ہے، وہ جب تک صفائی کی شہادت میں پیش نہ ہوں، وہ جب تک عمل کی اجازت نہ دیں، تب تک رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیکار و معطل ہی رہی، اس سے بڑھ کر باطل اور اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت اپنے بندوں پر اپنے رسول ﷺ کے ذریعے ختم کردی ہے نہ کہ کسی امتی کے ذریعہ سے اللہ کے

رسول ﷺ نے اپنی سنتوں کی تبلیغ کا حکم دیا ہے اور اپنی حدیثوں کے بیان کرنے والوں کے لیے دعا کی ہے، پس اگر حدیثوں کی تبلیغ کے بعد بھی اُن پر عمل ضروری نہ ہوتا جب تک مثلاً امام ابوحنیفہ یا امام شافعی رحمہما اللہ وغیرہ کا مذہب بھی اُن کے مطابق نہ ہو، تو فرمائیے کہ تبلیغِ حدیث کا فائدہ ہی کیا ہوا؟ پھر تو ان اماموں کا قول کافی وافی ہے۔ حدیث محض بے کار بلکہ دُور از کار چیز ٹھہری، اللہ تعالیٰ ایسے بدترین باطل عقیدے سے سب مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے......

رہا یہ بہانہ کہ ممکن ہے وہ حدیث منسوخ ہو، اُن کی بابت ہم کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کے منسوخ ہونے پر اُمت کو اتفاق ہے، اُن کی تعداد دس تک بھی نہیں بلکہ پانچ بھی نہیں۔ فرض کرلیا جائے کہ ان حدیثوں پر عمل کرنے میں خطا بھی ہوگئی تو پھر بھی بہ نسبت اس خطا کے جو کسی امام کی تقلید میں ہوسکتی ہے، بہت ہی کم بلکہ گویا نہ ہونے کے برابر ہوگی...... بالفرض اگر حدیث کو سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے تو کیا قول امام کے سمجھنے میں غلطی کا ہونا ممکن نہیں؟...... متبع سنت ممکن ہے کہیں غلطی کرجائے مگر مقلد امام تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، پس ٹھیک بات یہی ہے کہ دلالت حدیث ظاہر اور صریح ہے اس میں کوئی اور احتمال نہیں تو بلاشک وشبہ ہر انسان کو اس پر عمل کرنا بلکہ اس پر فتویٰ دینا بھی درست ہے.....'' [1]

کیا تعارض کی بنا پر حدیث قابل عمل نہیں......!

شاہ ولی اللہ دہلوی بھی حدیث پر عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں تعارض یا اختلاف ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک حدیث کے مفہوم پر عمل کیا جائے لیکن بعض اوقات دو یا اس سے زاید حدیثوں میں تعارض ہوتا ہے اور اس لیے سب پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، لیکن یہ جلیل القدر نکتہ یاد رکھو کہ اگر دونوں روایات

[1] اعلام الموقعین، حصہ ۷، ص ۳۰، ۱۳۲۹ .

درحقیقت نبی ﷺ کی حدیثیں ہیں اور مستند روایات سے منقول ہیں تو اُن میں حقیقتاً کبھی تعارض نہیں ہوسکتا۔ فقط ظاہری نظر میں تعارض معلوم ہوتا ہے.....''[1]

موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو وہ پہلے طبقہ کی کتب حدیث قرار دیتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالکؒ ہے، یہی بات بخاری کے بارے میں بھی کہی گئی اور خود شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ''صحیحین کے متعلق محدثین کا اتفاق ہے کہ جتنی متصل الاسناد مرفوع حدیثیں ان میں موجود ہیں، وہ سب قطعی الصحت ہیں، بلاشبہ صحیح ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کتب ان کے مصنفین سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں اور یہ بھی علماء کا قول ہے کہ جو کوئی بھی ان کو بہ نظرِ حقارت دیکھتا ہے وہ اہل بدعت میں سے ہے اور جو راستہ اس نے اختیار کر رکھا ہے، وہ مسلمانوں کا راستہ نہیں.....'' (ص ۶۲۳)

لیجیے ایک مثال:

علمِ حدیث ہی نہیں، کسی بھی شعبۂ علم سے کبھی بھی، سوائے جاہل اور احمق لوگوں کے کسی نے محض اس بنا پر قطع تعلق نہیں کیا کہ اس میں اختلافات ہیں۔ سائنسی علوم جو قطعیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہمارے مغرب زدہ افراد جس کا کلمہ پڑھتے ہیں، اُس میں اختلافات تو معلوم چیز ہے محض ''فرض کریں'' کی بنیاد پر بے شمار اصول وضع کیے گئے، تغیر زمانہ اور علوم کی ترقی نے اس درجہ سائنسی علوم کو متاثر کیا کہ نیوٹن کے عہد میں کہا جاتا تھا کہ سائنس ختم ہوگئی؛ دریافتیں مکمل ہوگئیں، اب آئن سٹائن بھی پرانا ہونے لگا ہے، ایسے میں کوئی شخص کیسے قطعیت کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ اس کے برعکس علومِ حدیث میں جو محنتِ شاقہ صرف کی گئی اور جس طرح افرادِ امت نے اپنے نبی ﷺ کی ایک ایک بات کو محفوظ کیا، اس کی نظیر نہیں لائی جاسکتی، تو کیا محض اپنی فقہی مسلک کی ترجمانی یا حفاظت کے لیے ہم اتنے بڑے سرمایہ سے افراد کو محروم کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا کوئی جواب رکھتے ہیں؟ آخر محدثین نے اتنی

[1] حجۃ اللہ البالغہ، حصہ اوّل، ص ۶۳۸.

محنت کس کے لیے کی؟ کیا یہ سرمایۂ عظیم محض چند افراد کے لیے تھا؟ ہرگز نہیں، تمام افرادِ امت کے لیے یہ سرمایہ جمع کیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت کیا گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی پیروی لازم کی۔

یہاں یہ بات سوچنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کام کو لازم کرے اور لازم بھی دائمی طور پر تو پھر اگر اُس پر عمل کرنے کی کوئی راہ نہ ہو تو پھر یہ لازم یا فرض نعوذ باللہ بے معنی ہوا اور اللہ تعالیٰ بے معنی یا لغو کام کرنے سے پاک ہے۔ لہٰذا احادیثِ رسول ﷺ کو جاننے کا پابند جس طرح ایک عالم و فاضل شخص ہے، اُسی طرح ایک عامی اور اَن پڑھ شخص پر بھی لازم ہے کہ وہ اُن پر عمل کے لیے اُن کی طرف رجوع کرے، یہ رجوع بھی اُس قرآنی حکم کے مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ١٦/ ٤٣)

''اہل ذکر (علماء) سے پوچھ لو اگر تمھیں علم نہیں ہے۔''

گویا عامی بھی پوچھنے کا پابند ہے اور اس کا یہ عذر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہیں چل سکے گا کہ اے خدا! چونکہ میں پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا اس لیے میں آپ کے رسول ﷺ کے فرمودات سے نابلد رہا۔ یہ ایک ایسا جواب ہے جس کا بوجھ اللہ تعالیٰ نے عامی پر ڈالا ہی نہیں، وہ تو محض اللہ اور رسول ﷺ کی بات یا حکم پوچھنے کا پابند ہے۔

محبت کا دعویٰ بغیر عمل کے کھوکھلا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اپنے نبی ﷺ سے محبت کا ہر دعویٰ بے بنیاد ہے جب تک اطاعتِ رسول ﷺ کی طرف رغبت اور شوق نہیں۔ محبتِ رسول ﷺ، اطاعتِ رسول ﷺ ہی ہے۔ اطاعتِ رسول ﷺ سے روگردانی اور شفاعت کی اُمیدیں! انتہائی نامعقول بات ہے، آپ نے کبھی غور کیا کہ قرآن وحدیث کے اولین مخاطب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اَن پڑھ تھے۔ جی ہاں! عربی زبان جانتے تھے مگر عربی زبان جاننے سے علم کا جاننا لازم نہیں ہوتا۔ آخر انگریز بھی تو انگریزی جانتے ہیں مگر اَن پڑھ بھی ہوتے ہیں، چنانچہ صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کی بات سنتے اور اس پر عمل کرتے، کہیں کوئی مشکل پیش آتی تو وضاحت طلب کر لیتے، یہ جذبہ دراصل اطاعت کے حقیقی شوق سے جنم لیتا ہے۔ آخر کچھ لوگوں نے یہ کیوں تصور کر لیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی باتیں مشکل ہیں یا اُن میں اختلافات ہیں۔ لہٰذا ہر شخص کو احادیث کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر کوئی اپنے نبی ﷺ کی کیا توہین کر سکتا ہے کہ وہ افراد کا راستہ، علومِ نبوت سے روک لے۔

آج جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں، علوم کی ترقی کا دور ہے۔ کتب کی اشاعت اتنی عام ہوگئی ہیں کہ ایک صدی قبل تک بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، پھر اصل کے ساتھ ترجمہ کا اہتمام بھی کر دیا گیا ہے اور ہر زبان میں قرآن وحدیث کا سرمایہ موجود ہے، اس پر مزید یہ کہ محدثین اور بعد میں آنے والے شارحین نے احادیث کی وضاحت و صراحت اس انداز سے کر دی ہے کہ عام پڑھا لکھا فرد بھی آسانی سے احادیث پر عمل کر سکتا ہے اور اس کے بعد تو عمل نہ کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں کہ محدثین و شارحین نے صحت وعدم صحت کے حوالے سے خوب تقسیم کر دی ہے۔ فقہ حنفی میں بھی جو آپ بے شمار اختلافات دیکھتے ہیں، جو امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں میں ہیں تو وہ اسی حوالے سے ہیں کہ ایسے مسائل جن کی بنیاد ضعیف احادیث یا قیاس و اجتہاد پر تھی، جب امام محمد اور امام یوسف کو احادیث ملیں تو انھوں نے اپنے اُستاد کے قول سے رجوع کر لیا۔ امام محمد جو امام مالک کے بھی شاگرد تھے، انھوں نے جب امام مالک سے احادیث سنیں تو اپنے قدیم اقوال سے رجوع کر لیا۔ یہ شاگردوں کا رویہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے استاد امام ابوحنیفہ کے مقلد نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہمارے استاد بھی فرما گئے ہیں کہ ''صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔'' لہٰذا یہ استاد کی بھی فرماں برداری ہے اور اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے فرض کیے گئے حکم کی بھی پیروی ہے کہ مسائلِ قیاس و اجتہاد میں احادیثِ رسول ﷺ کو قبول کیا جائے اور اپنی رائے یا اجتہاد کو ترک کیا جائے، وہ پوری طرح آگاہ اور باخبر تھے کہ نص کے مقابل اجتہاد نہیں۔

ائمہ اور عوام:

اگر آپ اتحادِ اُمتِ مسلمہ کے پس منظر میں اس بات کو دیکھیں تب بھی نبی پاک ﷺ کی طرف رجوع لازم ہے۔ بلاشبہ اپنے وقتوں میں اماموں نے نہایت نیک نیتی سے افرادِ امت کی آسانی کے لیے قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کیا۔ ان کا مقصد بھی مسلمانوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا تھا کیونکہ تمام افراد تمام مسائل کا حل خود قرآن و حدیث سے نہیں لے سکتے، لہٰذا اہلِ ذکر سے رجوع کا حکم دیا گیا، تاہم پھر اس بات میں بھی شک نہیں کہ یہ امام چونکہ متبع سنت تھے، لہٰذا اپنی رائے سے رجوع کرتے رہے۔ چنانچہ امام شافعی کے تو بے شمار قول قدیم اور جدید میں تقسیم ہیں اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہہ رکھا تھا کہ تم حدیث کو مجھ سے زیادہ جاننے والے ہو اگر تمھیں کوئی ایسی حدیث ملے جس کی مجھے خبر نہ ہو تو مجھے آگاہ کرنا۔ اس طرح تمام امام اپنے اپنے ذرائع اور قوت کے مطابق حدیث سے رجوع لاتے رہے۔ یہ جو فقہ میں تدریجی عمل ہے اور چار امام مشہور ہیں، خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر بعد میں آنے والے امام نے اپنے سے قبل امام کی فقہ کو مکمل نہ پاکر یا مسائل میں اختلاف کی بنیاد پر اپنی فقہ ترتیب دی۔ دوسرے افراد نے بھی اِس نوعیت کا کام کیا مگر وہ بوجوہ نمایاں نہ ہوئے۔ چنانچہ ان چار اماموں کی فقہ کو چوتھی صدی ہجری کے بعد امت میں رواج ہوا، برصغیر پاک و ہند میں فقہ حنفی کو رواج ملا اور امام ابوحنیفہ "امام اعظم" قرار پائے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے ایک دوست الجزائر معلم کی حیثیت سے گئے، واپسی پر انھوں نے بتایا کہ میں یہ سن کر حیران ہوگیا کہ الجزائر میں امام مالک کو امام اعظم کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص یا گروہ جس امام کی تقلید کر رہا ہے، وہ اس کے نزدیک امام اعظم ہے۔

یوں گویا اُمت چار بڑے فقہی مسالک میں تقسیم ہوگئی، اب یہ سلسلے بہت آگے بڑھ چکے ہیں مگر یہ صورتِ حال مطلوب نہیں، نہ اس ضعیف روایت کہ "میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے" سے استدلال اس تقسیمی صورتِ حال کا جواز ہے بلکہ اتحاد ہی رحمت ہے اور

امتِ مسلمہ کے لیے مطلوب یہی ہے، تمام افرادِ اُمت ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے اماموں کو اعظم کہنے کے بجائے محمد ﷺ کو "امامِ اعظم" قرار دیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ "مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَیْنَ النَّاسِ" محمد ﷺ معیارِ حق ہیں۔"

اتباع، تقلید، ایک تقابل:

"نبی ﷺ جو تمھیں دے لے لو اور جس سے روکیں رک جاؤ" کا اصول بھی اسی بات کا متقاضی ہے کہ اُمت کو اپنے نبی ﷺ پر جمع کیا جائے۔ اس کے علاوہ اتحاد واتفاقِ امت کا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور یہ راستہ خود اماموں نے بھی دکھایا ہے اور قیامت والے دن یہ بات خود اس امام کے لیے بھی نفع بخش ہوگی جس نے اس کی بات مان کر اپنا رہبر و رہنما مصطفےٰ ﷺ کو تسلیم کرلیا ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی توحید میں شرک کی آمیزش کرنے والوں سے وہ افراد برأت کا اعلان کریں گے اور کہیں گے۔ جیسا کہ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمائیں گے: "پاک ہے تیری ذات، میں ایسی بات کیوں کہوں جس کا مجھے حق نہیں پہنچتا۔" اسی طرح امام بھی ایسے شخص سے برأت کا اعلان کریں گے کہ ہم نے کب کسی پہ اپنی اطاعت لازم کی تھی، ہم رسول تو نہ تھے، بلکہ ہم تو کہہ آئے تھے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا اور ہمارے قول کو دیوار پر مارنا، اب اس سے زیادہ اور کون سی بات اماموں کی طرف سے اپنی مطلق پیروی سے منع کرنے والی ہے کہ وہ خود کو "مطاع" کا درجہ نہیں دیتے اور یہی اُن کی عظمت ہے۔

امام ابن القیم لکھتے ہیں:

> "تقلیدِ شخصی وہ بدعت ہے جو تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔ ائمہ اسلام میں سے کسی ایک نے بھی اس کی ہدایت نہیں کی۔ اُن کی جلالت، اُن کا علم، اُن کی بزرگی، اُن کی خداترسی اس سے بہت پاک تھی کہ وہ کسی کو کسی اُمتی کی ایسی تابعداری لازم کریں۔ اس سے بھی زیادہ بُری بات اُن کی ہے جو کہتے پھرتے ہیں کہ کسی نہ کسی عالم کی ماننی ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ بُرا قول اُن کا ہے جو مروّجہ چار مذاہب کی دعوت دیتے پھرتے ہیں اور لوگوں پر اُنھیں لازم کرتے

پھرتے ہیں۔ سخت تر تعجب کی بات ہے کہ لاکھوں صحابیوں، تابعیوں، تبع تابعین، ائمہ دین کے مذاہب مار ڈالے جائیں اور صرف چار شخصوں کے مذاہب کو زندہ رکھا جائے، دوسرے ائمہ، فقہاء اور محدثین کو یہ حق ہی نہ دیا جائے۔'' [1]

اطاعت ہر ایک سے مطلوب ہے:

غرض ہر فرد پر یہ لازم ہے کہ وہ نظری سطح پر اس عقیدہ کو اختیار کرے کہ میں ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پابند ہوں، اُن کی اطاعت مجھ پر لازم ہے اور کسی غیر نبی کی اطاعت مجھ پر لازم نہیں۔ صاحبِ امر، خواہ کوئی ہو، کی اطاعت بھی تبھی لازم ہے جب وہ اللہ اور رسول ﷺ کے تابع فرمانی میں ہو۔ اگر کوئی فرد یا گروہ دانستہ یا نادانستہ اطاعتِ رسول ﷺ سے روگردانی کرتا ہے یا وہ کوئی تاویل کرتا یا واسطے، وسیلے تلاش کرتا ہے اور عالم یا عامی کو نبی ﷺ کی براہِ راست پیروی سے منع کرتا ہے، خواہ وہ اس کے لیے کتنے جواز لائے، ہرگز قابلِ اتباع نہیں۔ عامی کو محض اس بنا پر رعایت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بے علم ہے۔ اگر وہ بے علم ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کب فرض کیا ہے کہ وہ لازماً خود پڑھے لکھے اور علوم القرآن وحدیث سے آگہی حاصل کرے اور پھر عمل کرے۔ وہ تو صرف سوال کرنے کا مکلّف ہے۔ اب سوال پر اس کی نجات کا دارومدار ہے کہ وہ علم والے سے کسی غیر نبی کی رائے یا مسئلہ کے بارے میں سوال کرتا ہے یا براہِ راست اپنے نبی ﷺ کی بات پوچھتا ہے۔ جب اللہ نے اس پر لازم ہی اپنے نبی کی اطاعت کی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ پوچھے کہ اس مسئلہ میں میرے نبی ﷺ کا کیا فرمان ہے؟ اور یہی راہِ صواب ہے اور یہی تمام بزرگانِ دین، فقہاء اور محدثین کا راستہ ہے کہ وہ تمام اپنے نبی ﷺ کے پابند تھے۔

آلِ شیخ کے ایک مصنف عبدالرحمان ''قرۃ عیون الموحدین'' میں رقمطراز ہیں:

''آج کل مسلمانوں کی اکثریت اسی مرض میں مبتلا ہے خصوصاً اہل علم وہ اس کی عین ضد ہیں، انہوں نے ایسا جال بچھا رکھا ہے جس سے گذر کر عام آدمی

[1] اعلام الموقعین، ص ۱۳۵۵ ۔

کتاب وسنت اور اتباعِ رسول ﷺ کی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔''

حدیث کی آئینی حیثیت:

بعض ایسے افراد جو حدیث کی تشریعی یا آئینی حیثیت کے قائل نہیں اور نہ نبی پاک ﷺ کو دائمی طور پر رہنما قبول کرتے ہیں، حدیثِ رسول ہی سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے خود اپنی احادیث لکھنے سے منع فرمایا۔

اس استدلال کا تناقض بذات ہونا کس قدر عیاں ہے کہ جس چیز کو رد کیا جا رہا ہے، اُسی کو دلیل بنایا جا رہا ہے، یعنی حدیثِ رسول سے دلیل دی گئی کہ حدیثِ رسول نہیں لکھنی چاہیے۔ یہاں ایک وقتی مصلحت کو تو ابدیت میں قبول کر لیا گیا، وہ روایتیں جو حدیث لکھنے کی ترغیب اور حکم دیتی ہیں، اُن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثلاً:

> ''سیّدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! ہم لوگ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے بہت سی باتیں سنتے ہیں اور انہیں لکھ لیتے ہیں، آپ ﷺ کا اس بارے میں کیا ارشاد ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔'' سیّدنا ابورافع مصری رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ سیّدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں'' ایک شخص نے شکایت کی کہ اسے حدیثیں یاد نہیں رہتیں، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے ہاتھ سے مدد لو۔'' (یعنی لکھ لیا کرو) سیّدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں'' میں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتا، لکھ لیا کرتا تاکہ اسے یاد کر لیا کروں، قریش نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ محمد ﷺ بشر ہیں، کبھی غصہ میں بھی بات کر دیتے ہیں، چنانچہ میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔'' پھر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کچھ مجھ سے سنو، ضرور لکھ لیا کرو، اس ذات کی قسم جس کے

ہاتھ میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے بغیر کچھ نہیں نکلتا۔'' سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ نے خاص طور پر اپنی ضرورت کے تحت غیر ملکی زبان اور تحریر سیکھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ یہاں منع کتابت والی یہ حدیث:

((تَكْتُبُوا عَنِّى شَيْئاً غَيْرَ الْقُرْآنِ .))

''قرآن کے علاوہ مجھ سے کوئی بات نہ لکھو''

کی وضاحت کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت رسول اکرم ﷺ قرآنی آیات کے علاوہ ان کی تفسیر وتشریح میں جو کچھ ارشاد فرماتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے ایک ہی جگہ لکھ لیتے تھے۔ ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے پوچھا'' یہ کیا لکھ رہے ہو؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا'' وہی جو کچھ آپ ﷺ سے سنتے ہیں۔'' تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی کتاب لکھی جارہی ہے، اللہ کی کتاب علیحدہ کرو اور اسے خالص رکھو۔'' رسول اکرم ﷺ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآنی آیات اور ان کی تفسیر (احادیث) دونوں یکجا لکھ رہے تھے جسے آپ ﷺ نے الگ الگ رکھنے کا حکم دیا، نہ یہ کہ احادیث لکھنے کی مطلقاً ممانعت فرمائی۔ جب قرآن مجید پوری طرح حفظ کرلیا گیا تو ممانعت کا حکم از خود ختم ہوگیا۔ اس کی تفصیل کے بعد ہم عہدِ نبوی (11ھ تک) میں کتابت اور تدوینِ حدیث کی مثالیں پیش کررہے ہیں۔ یادرہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کے علاوہ وہ تحریریں جو آپ ﷺ نے خطوط، معاہدات، نیز سرکاری حکام کے نام احکام وہدایات کی شکل میں تیار کروائیں، وہ سب احادیث کہلاتی ہیں۔'' ❶

❶ اتباعِ سنت کے مسائل از محمد اقبال گیلانی، ص ۳۷،۳۶۔

حدیث کی اہمیت وضرورت:

پھر اُمت کا اجماعی عمل بھی اسی رویے کی تائید کرتا ہے۔ اگر حدیثِ رسول کی اہمیت محض زمانی ہوتی اور بعد میں اولوالامر کے لیے محض قرآن حکیم کی رہنمائی کافی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور نہ بعد کے ادوار میں آنے والے محدثینِ کرام اس مشقت میں پڑتے۔ حقیقت میں یہ ساری تگ ودو اِس بات کی غماز ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت محض اپنے زمانے والوں کے لیے نہ تھی بلکہ اس کی ابدی طور پر ضرورت تھی۔ لہٰذا محدثین نے اِس کو اس قدر جاں فشانی سے محفوظ کردیا کہ کسی بھی دوسرے نبی کی زندگی میں اس کی نظیر نہیں ۔گوکہ وہ سب سچے نبی تھے اور یہی بات پھر محمد ﷺ کو امتیاز دیتی ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام اپنے زمانوں کے لیے اور آپ اُن کے بعد تا ابد ہیں ؎

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ، ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے ، وہ تنہا تیرا

حدیثِ رسول کی سماجی ضرورت:

حدیثِ رسول ﷺ کی عملی افادیت وضرورت کو اجاگر کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقہاء ومحدثین کے کام کی اہمیت کم کی جائے۔ مقصود صرف اس قدر ہوتا ہے کہ کسی بھی غیر نبی کو دائمی طور پر تمام معاملاتِ زیست میں اس طرح قبول کیا جائے جس کے بعد عملاً قرآن وحدیث معطل ہو کر رہ جائیں۔ ایک مقلد کے لیے اپنے امام کا قول حجت ہے اور بس۔ اس سے آگے وہ قرآن وحدیث سے کسی مسئلہ کو نہ خود، نہ کسی دوسرے کے بتانے سے قبول کرسکتا ہے، نہ عمل کرسکتا ہے کیونکہ براہِ راست دلیل (قرآن وحدیث) کی پیروی مقلد نے خود اپنے لیے ممنوع کر رکھی ہے۔ گویا نقل تو یوں گئی اور عقل بقول ابنِ جوزی ''تقلید عقل کی منفعت کو زائل کرتی ہے'' کے مصداق وہ عقل وشعور سے بھی کام نہیں لے سکتا۔ چنانچہ ہمارے یہاں تقلیدِ شخصی پر اصرار نقل وعقل دونوں کے خلاف ہے اور خود فقہاء کی بھی تنقیص لازم آتی ہے کہ تین فقہاء کو بغیر دلیل وشعور کے چھوڑ کر صرف ایک کو لازم کرلیا

جائے، یہ لزوم اپنے اندر کوئی معیار نہیں رکھتا۔

حافظ صلاح الدین یوسف رقمطراز ہیں:

''اِس تفصیل کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم فقہ حنفی (جس کے ماننے والوں کی ہمارے ملک میں اکثریت ہے) اور دیگر فقہوں سے استفادے کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک فقہاء کی یہ فقہی کاوشیں قابل صد احترام ہیں جن کا استخفاف مقصود نہیں۔ تاہم اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فقہاء نے اپنے اپنے حالات و عُرف کے مطابق اجتہاد کیا اور شرعی احکام مستنبط کیے۔ اب حالات کے تقاضے اور اُن کی نوعیتیں مختلف ہیں، عرف بدل چکے ہیں اور نئی تہذیب و تمدن اور اس کی بوقلمونیت نے بہت سی نئی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں۔ ان حالات میں گذشتہ صدیوں کے فقہاء کے اجتہادی احکام کو من وعن نافذ کرنے پر اصرار کوئی معقول طریقہ نہیں ہوگا، نہ اکثریت و اقلیت کا راگ الاپنا مناسب ہے، اصل چیز قرآن وحدیث کی برتری اور عوام کی سہولت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے بعد چاہے بنیاد فقہ حنفی کو بنالیا جائے لیکن استفادہ دیگر فقہوں سے بھی کیا جائے اور جو فقہی مسئلہ موجودہ زمانے کے مقتضیات سے زیادہ ہم آہنگ اور موافق بالناس ہو، اسے اپنا لیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مسئلہ حنفی کا ہو، یا فقہ شافعی کا، فقہ مالکی ہو یا فقہ حنبلی کا۔ اس طریقے سے اِس تقلیدی جمود، حزبی تعصب اور گروہ بندی کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی جس کو اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ باور کرایا جاتا ہے اور جس سے لادین عناصر غلط فائدہ اٹھا کر اسلامی نظام کے نفاذ کو ٹالتے چلے آرہے ہیں اور اس طرح عصری مسائل کا حل بھی سہل تر ہو جائے گا۔'' [1]

حدیثِ رسول کے ساتھ تقلیدی رویہ:

مقلدین، حدیثِ رسول ﷺ کو نظری طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں، صرف عملاً اُس پر

[1] سہ ماہی ''منہاج'' [اجتہاد نمبر] مدیر: سید محمد متین ہاشمی۔

مجتہد کو حاکم تصور کرتے ہیں اور اُس کے استنباطی مسائل پر عمل کرنے کا خود کو پابند کر لیتے ہیں لیکن بعض افراد جو سرے سے احادیثِ رسول ﷺ کے منکر ہیں اور انھیں محض اپنے دور کی تاریخ خیال کرتے ہیں، تو اُن کے رد میں بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں چونکہ یہ موضوع نہیں، لہٰذا قارئین اضافی مطالعہ کے لیے حجیت حدیث کے لیے معروف کتب پڑھ سکتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ کو قبول کرنے میں کوئی شے مانع نہیں، ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک ﷺ کا پابند کیا ہے اور لازم وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ لازم کرے۔ قیامت والے دن تمام افراد سے، وہ خواہ کسی درجے کے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کے اتباع کے بارے میں پوچھے گا۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لیے عقیدہ یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف اور صرف اللہ اور رسول ﷺ کا پابند سمجھے، باقی جو بھی ہے، اگر وہ نبی پاک ﷺ کے قول و فعل کے مطابق ہے تو درست، ورنہ قابلِ رد ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو پہلی بار کہی گئی ہو۔ تواتر سے افرادِ اُمت یہی کہتے چلے آ رہے ہیں بلکہ فقہاءِ اُمت کی یہی تعلیم و تلقین رہی ہے۔

(۱) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول:

صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

((لَا يُقَلِّدَنَّ رَجُلٌ رَجُلًا .))

''کوئی شخص کسی شخص کی تقلید نہ کرے۔'' [1]

ائمہ کرام اور تقلیدی مذاہب

(۲) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

((لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّأْخُذَ بِقَوْلِي مَا لَمْ يَعْلَمْ مِنْ اَيْنَ قُلْتُ وَنَهٰى مِنَ التَّقْلِيْدِ وَنَدَبَ اِلَى مَعْرِفَةِ الدَّلِيْلِ .))

[1] میزان الکبریٰ شعرانی، ص٤٧، ج١، مجمع الزوائد .

کسی شخص کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ میرا قول لے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے وہ بات کس دلیل سے کہی ہے۔" ❶

(۳) امام مالک رحمہ اللہ کا قول:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أُخْطِئُ وَأُصِيبُ فَانْظُرُوا فِي رَأْيِي فَكُلَّمَا وَافَقَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَخُذُوهُ وَكُلَّمَا لَمْ يُوَافِقْ فَاتْرُكُوهُ.))

"میں ایک انسان ہوں خطا اور صواب (غلط اور صحیح) دونوں کہہ سکتا ہوں، پس تم میری رائے کو پرکھا کرو جب بات قرآن وسنت کے موافق ہو اسے لے لیا کرو اور جو بات موافق نہ ہو اسے ترک کر دیا کرو۔" ❷

(۴) امام شافعی رحمہ اللہ کا قول:

((نَهْيُهُ عَنْ تَقْلِيدِهِ غَيْرَهُ لِيَنْظُرَ فِيهِ لِدِينِهِ وَيُحْتَاطُ لِنَفْسِهِ.))

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع فرمایا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ ہر ایک شخص اپنے دین کے لیے خود دیکھے اور احتیاط سے کام لے۔" ❸

(۵) امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول:

((لَا تُقَلِّدُونِي وَلَا تُقَلِّدَنَّ مَالِكًا وَلَا الْأَوْزَاعِيَّ وَلَا النَّخْعِيَّ وَلَا غَيْرَهُمْ وَخُذُوا الْأَحْكَامَ مِنْ حَيْثُ أَخَذُوا مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.))

"نہ تم میری تقلید کرو نہ امام مالک رحمہ اللہ کی تقلید کرو، نہ امام اوزاعی رحمہ اللہ کی تقلید کرو اور نہ کسی اور کی تقلید کرو بلکہ جس طرح انھوں نے احکام ومسائل قرآن وحدیث سے لیے ہیں تم بھی وہیں سے لو۔" ❹

❶ مقدمہ هدایه ص ۹۳ . ❷ جلب المنفعة، ص ۶۸ .

❸ مختصر المزنی: ص ۲، ج ۱ علی حاشیہ کتاب الام .

❹ عقد الجید، ص ۸۱۔ بحوالہ "خیرخواہی" محمد افضل خلیل احمد اثری"، ص ۷۰۔۶۷۔

ایک مثال لیجیے:

آخر میں سبیل الرسول ﷺ، مصنفہ محمد صادق سیالکوٹی کا درج ذیل اقتباس، روزمرہ کی مثالوں سے مزّین ملاحظہ فرمائیے:

''ایک آنہ کے آلو یا دو پیسے کے پیاز لیتے وقت آپ اتنی چھان بین کرتے ہیں کہ سبزی فروش کا ٹوکرا الٹ پلٹ کر دیتے ہیں، کپڑا خریدتے وقت اچھی طرح دیکھتے ہیں، کہ کپڑا خراب نہ ہو، گرم کپڑا خریدنا ہو تو خوب غور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تار سوت کا نہ ہو۔ دودھ، دہی، گھی وغیرہ کی خوب پڑتال کرتے ہیں کہ خالص ملے۔ لیکن یہ کتنا اندھیرا ہے کہ دین حاصل کرنے کے لیے ساری عمر ایک ہی امام کی تقلید جامد (BLIND FAITH) کرکے، آنکھیں بند کرکے دلیل سے بے نیاز ہو کر اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس کے قول کو دین مان کر عمل کرتے رہتے ہیں۔ کیا دین کے مسائل اور مذہب کی ضروریات میں چھان بین کی ضرورت نہیں۔ جن امور پر نجات آخرت کا دارومدار ہے، ان میں جانچ پڑتال کی حاجت نہیں؟ دنیا کے مال کی ریزگاری کو خوب پرکھنا، کہ کہیں اس میں کھوٹا سکہ نہ ہو، اور دین کی ریزگاری کو آنکھیں بند کرکے جیب میں ڈال لینا کون سی عقلمندی ہے؟ اور پھر اس اندھا دھند تقلید، آنکھیں بند کرکے اقوال پر چلنے کا نام اہلِ سنت والجماعت رکھا ہے۔ کتاب وسنت کے دلائل و براہین کے نور سے بے اعتنائی برتو، تو اہلِ سنت اور ذرا آنکھ جھپکی تو اہلِ سنت سے خارج؟!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے''

حقیقت اولیٰ
(Ultimate Reality)

[زیر نظر تحریر بنیادی طور پر ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحہ کے لیے ایک مضمون نگار کے جواب کے طور پر لکھی گئی کہ جس کی دعوت انچارج نے دی تھی اور دو اقساط میں شائع ہوئی۔ اس میں سائنس اور فلسفہ زیرِ بحث رہے۔ تاہم جیسا کہ اس کے عنوان'' فلسفہ، طبیعات اور مابعد الطبیعیات'' سے ظاہر ہے اس میں الٰہیات کے مسائل بھی زیرِ بحث آئے، چنانچہ ایک نقطۂ نظر کی حیثیت سے بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کی جارہی ہے۔ یہاں اس تحریر کی حیثیت اضافہ وترمیم کے بعد بدل گئی ہے۔ لہٰذا مضمون نگار کا نام حذف کر دیا گیا ہے اور عنوان بھی بدل دیا گیا۔] صاحبِ مضمون لکھتے ہیں:

> ''سائنس کا جہاں تک تعلق ہے بنیاد کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اصل شے تو وہ ڈھانچہ ہے جو اس کے اوپر تعمیر کیا جاتا ہے، سائنس کی تعمیر، عمارت کی تعمیر سے بالکل جداگانہ شے ہے کیونکہ اس کی بنیاد تعمیر کے کئی برس بعد بھی تبدیل کی جاسکتی ہے اور ایسا کرنے سے عمارت کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''حتمی بنیاد کا تصور بجائے خود ایک مفروضہ ہے، لہٰذا یہ اصول صرف ریاضی تک محدود نہیں بلکہ پورے انسانی علوم اور شاید تمام کائنات پر محیط ہے۔''

فرضیت، ایتھر اور وحدۃ الوجود:

اس میں شک نہیں کہ سائنسی علوم میں ''فرضیت'' پر بنیاد رکھی جاتی ہے، مگر اس فرضیت میں بنیاد کی اہمیت کا راز پوشیدہ ہے۔ یعنی بغیر بنیاد کے کسی بھی نوع کے تجربات یا تحقیق کو

آگے بڑھایا ہی نہیں جاسکتا، پھر یہ فرضی بنیاد بھی ایک مجبوری ہے حقیقی بنیاد کے فقدان کی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سائنسی نظریات میں جو آئے دن تبدیلی وتغیر کا عمل ہوتا رہتا ہے وہ اسی فرضیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کے پاس جب بنیاد نہیں ہوتی تو وہ فرضیت پر کام چلاتی ہے یہ فرضیت کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوتی ہے۔ مثلاً ایک طویل عرصہ تک روشنی (Light) کے سفر کے لیے ایتھر کو ایک میڈیم تصور کیا گیا اور کہا گیا کہ ساری فضا ایتھر سے بھری ہوئی ہے۔ اِسی ایتھر کے تصور کو فلسفہ میں وحدت الوجود کے تصور کو تقویت دینے کے لیے استعمال کیا گیا، مگر بعد میں تجربات سے معلوم ہوا کہ روشنی کو سفر کے لیے کسی میڈیم کی ضرورت ہی نہیں اور فضا میں کوئی ایسی چیز سرے سے موجود ہی نہیں جسے ایتھر کا نام دیا گیا۔ اسی طرح نیوٹن کے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ اب سائنس میں مزید کسی ترقی کی گنجائش نہیں مگر آج نیوٹن کے بیشتر قوانین غلط قرار دیے جاچکے ہیں۔

جہاں تک صاحب مضمون کا یہ خیال ہے کہ حتمی بنیاد کا تصور بجائے خود ایک مفروضہ ہے تو یہ پہلے خیال سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس میں ''فرضیت'' کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی عمارت کو خواہ وہ علمی ہو یا مادی، غلط یا مفروضہ بنیاد پر تو تعمیر کیا جاسکتا ہے، مگر جب تک حتمی بنیاد میسر نہ آئے تو اُس وقت تک اس کی مضبوطی یا درستی کی گواہی نہیں دی جاسکتی۔ سائنس یا فلسفہ میں یہ خیال دراصل نتیجہ ہے حقیقت تک نارسائی کا، چونکہ ہر دو علوم عقلی اور تجربی حوالے سے حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ لہٰذا متعلقہ افراد بنیاد کی اہمیت اور حتمیت سے انکار میں، اپنی پناہ گاہ تلاش کرتے ہیں۔

مضمون نگار بطور مثال کہ فرضی اینٹیں نکال بھی دی جائیں اور بنیاد کے بغیر بھی عمارت قائم رہتی ہیں، کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مثال کے طور پر ڈاردن کے نظریۂ ارتقا ہی کو لے لیجیے، ابھی تک اس کی کئی گمشدہ کڑیاں دریافت نہیں ہوسکیں، ابھی تک اس عمارت میں بہت سی فرضی اینٹیں رکھی ہوئی ہیں، یہ سمجھیں فرضی اینٹیں نکال بھی دی گئی ہیں کیونکہ اس سے

بہتر متبادل میسر آگئے تھے۔ ڈارون سے لے کر اب تک یہ عمارت مجموعی طور پر شاید ہی تبدیل ہو۔ البتہ اس کے کئی مفروضے غلط بھی ثابت ہو چکے ہیں، مگر عمارت کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا۔''

مندرجہ بالا تحریر خوش عقیدگی کی عمدہ مثال ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ:

ڈارون کا نظریۂ ارتقا ...... جو دراصل نظریہ نہیں مفروضہ ہے، روزِ اول ہی سے تنقید کی زد میں رہا اور بتدریج دم توڑ گیا اور پھر، لوئی پاسچر، ٹنڈل، ہکسلے اور لسٹر کے تجربات کے بعد یہ بات سائنسی اصول کے طور پر تسلیم کر لی گئی کہ ''حیات از حیات'' یعنی حیات، ماقبل حیات ہی جنم لے سکتی ہے، آخر ڈارون کے اصولِ اتفاق (Law of Chance) کو آپ کس خانے میں رکھ سکتے ہیں کہ کاربن ،آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور بوران ایسے عناصر ایک خاص ماحول (Environment) میں اتفاقی طور پر یکجا ہوگئے اور ایک خلیہ (Cell) وجود میں آ گیا، پھر اِس خلیہ (Cell) میں اتفاقی طور پر (By Chance) حیات (خدا جانے کہاں سے آ کر) داخل ہوگئی اور پھر ایک اندھا ارتقا شروع ہوگیا اور دورانِ ارتقا پہاڑ قامت ڈائنوساز [1] بھی وجود میں آئے مگر جہد بقاء (Struggle for Existence) میں صرف وہی انواع باقی رہ سکیں جو انتخاب طبعی (Surrival of the fittest) کے اصول پر پوری اُتریں۔ نظریۂ ارتقا کے بارے میں چند باتوں کی طرف اشارہ

[1] ٹورنٹو (نیٹ نیوز) عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کرۂ ارض پر ڈائنوسار موجود تھے جو اپنے سائز کے حساب سے دنیا کی سب سے بڑی مخلوق تھی تاہم حال ہی میں کینڈین سائنس دانوں کی ٹیم نے دعویٰ کیا ہے کہ انھیں جنوبی البرٹا میں ایسے شواہد ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خطے میں کبھی کتے کے سائز کے ڈائنوسار بھی موجود تھے، سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ڈائنوسارز کی کئی اقسام موجود تھے، سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ڈائنوساز کی کئی اقسام تھیں، ان میں چھوٹے ڈائنوسارز بھی تھے جو دو ٹانگوں پر چلتے تھے اور پودے کھاتے تھے جبکہ ان کا وزن صرف 40 کلوگرام ہوتا تھا۔ سائنسدانوں کے مطابق ڈائنوسارز کے متعلق بہت کم شواہد موجود ہیں تاہم جنوبی البرٹا سے ملنے والے نئے فاسلز حیران کن ہیں جن کے تجزیے سے معلوم ہوتا کہ جرمن شیفرڈ کے سائز کے برابر ڈائنوسار بھی کبھی زمین پر موجود تھے۔

کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ اس نظریہ یا مناسب الفاظ میں مفروضہ کو تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر، نصابی ضرورتوں کے لیے پڑھایا جاتا ہے یا پھر اسے وہ افراد زندہ رکھنے کی سعی ناکام کرتے ہیں جو تخلیقِ ربانی کے نظریہ سے الرجک ہیں۔ اِس نظریہ پر تفصیلی اور سیر حاصل بحث ترکی کے مصنف یحییٰ ہارون نے اپنی کتاب ''نظریۂ ارتقا__ایک فریب'' میں کی ہے۔

نظریۂ ارتقا اور وجودی فلسفہ:

اس مفروضہ کے چند نقائص درج ذیل ہیں:

① مختلف عناصر کا اجماعِ اتفاقی، یہ مفروضہ (بے بنیاد) ہے۔ اتفاق (Chance) کوئی سائنسی بنیاد نہیں اور نہ اب تک اسے کوئی بنیاد فراہم کی جا سکی ہے۔

② حیات (Life) کی تشریح سے یکسر عاری ہے، عناصر کا اتفاقی اور متناسب اجتماع ہی ناممکن تھا، اس پر مستزاد کہ حیات بھی کہیں سے آ کر خلیہ میں داخل ہوگئی۔

③ گمشدہ کڑیاں (Missing Links) اس کی مشہور کمزوری ہے۔

④ بقول سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ، ڈارون، ''تنوعات کی علت'' کے بارے میں خاموش ہے۔ لامارک نے تنوعات اور تغیرات کو حیاتیاتی ضرورت کا نتیجہ قرار دیا۔ جیسے مثلاً قدیم زمانے میں گھاس کی کمی نے زرافے کی گردن درختوں پر خوراک کے حصول میں لمبی ہوگئی۔ یہ بات بھی حقائق وشواہد کے خلاف ہے۔

(۱)...... قدیم زمانے میں جب کہ آبادی بہت کم تھی اور جنگلات بھی زیادہ تھے کہ گھاس کی کمی محض ایک خیالی توجیہ ہے۔ مشاہدہ بھی اس کی نفی کرتا ہے۔ بکری جب درختوں پر پتے دیکھتی ہے تو اگلی دونوں ٹانگوں کی مدد سے اوپر اٹھتی ہے۔ اگر یہی توجیہ ہوتی تو سارے گھاس خور جانوروں کی گردنیں لمبی ہوتیں۔

(۲)...... لامارک ان تغیرات کو وراثتی کہتا تھا۔ لیکن 1870ء میں اگست وائز مین (August Weismann) نے مسلسل کئی نسلوں تک چوہوں کی دم کاٹی مگر ہر بار دُم

والے چوہے پیدا ہوئے۔ اس سے ایک طرف تو لامارک کی یہ بات بھی درست نہ رہی کہ سانپ کے چار پاؤں تھے، عدم استعمال سے ختم ہوگئے اور دوسری طرف جنیاتی اصول سے معلوم ہوا کہ جنسی سیلز (Germ Cells) کے بغیر ایک نوع کی خصوصیات اگلی نوع میں منتقل نہیں ہوتیں۔

۵ کہا جاتا ہے کہ اگر ڈارون کے عہد میں DNA دریافت ہوجاتا تو ڈارون کبھی بھی نظریہ پیش نہ کرتا کیونکہ اس اصول کے تحت ہاتھی سے ہاتھی اور چوہے سے چوہے کا بچہ ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ جینٹکس (Genetics) نے مزید وضاحت کردی کہ ہر نوع میں کروموسومز (Chromosomes) کی مخصوص تعداد ہوتی ہے۔ مثلاً انسان میں 46، مینڈک میں 26 اور مٹر میں 14 کروموسومز ہیں، یہ والد اور والدہ ہر دو کی طرف سے ہوتے ہیں مثلاً انسان میں 23، 23 کروموسومز کے دو سیٹ ہوتے ہیں ہر دو طرف سے ہوتے ہیں جو ہماری موروثیت کا تعین کرتے ہیں۔

۶ ذہنی اعمال، خیال، شعور، تفکر وغیرہ کی تشریح سے قاصر ہے۔ جب کہ یہ ذہنی اعمال قطعی طور پر انسان کی انفرادیت کا تعین کرتے ہیں۔

۷ انواع میں جوڑے بنانے اور گروہی حالت میں رہنے کا عمل بھی اُن نتائج کی مکمل نفی کرتا ہے، جو ڈارون یا مابعد، مصنوعی چناؤ یا گرافٹنگ کے ذریعے حاصل کیے گئے۔ جوڑے بنانے کا یہ عمل اس قدر فطری بلکہ جبریت کا پہلو اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کے لیے کوئی جنسی رغبت نہیں رکھتی، شیر، ہرن یا بکری کو صرف خوراک کی حیثیت سے دیکھتا ہے، مصنوعی ماحول میں وہ اپنے فرد کے لیے بھی ان جذبات سے یکسر عاری ہوجاتا ہے، دو چار دن قبل ٹی وی پر یہ خبر آئی کہ چڑیا گھر میں افزائش نسل کے لیے شیر کے پنجرے میں یکے بعد دیگرے، تین شیرنیاں چھوڑی گئیں مگر شیر نے تینوں کو ہلاک کردیا (آہ قیدی شیر!) گرافٹنگ سے بھی خصوصیات میں کمی بیشی ہوتی ہے، نوع تبدیل نہیں ہوتی۔

چنانچہ زیادہ دودھ دینے والی گائیں جیسے نیلی راوی، سائیوال گائے یا زیادہ گوشت والی مرغیاں لیئر یا میکسی پاک گندم اور سپر کرنل بناسپتی چاول ایسی مخلوط نسل کشی (Hibridsation) انواع میں خصوصیاتی تغیرات کی مثالیں ہیں اور آخری بات کہ ۲۵ لاکھ انواع سے صرف حضرت انسان ہی ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں، یہ انفرادیت کہاں سے آ گئی؟ مصنوعی کراسنگ کے نتیجہ میں "خچر" غیر بارآور (Unfertitle) نسل حاصل ہوئی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوعی تغیر جینز کے حوالے سے بھی ارتقا پذیر نہیں ہوسکتا۔

نظریۂ ارتقا اور عقلی دلیل:

یہاں طرابلس کے نامور محقق علامہ حسین آفندی کی ایک عقلی دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اگر صوری مشابہت کی بنا پر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ انسان اور بندر کی اصل ایک ہے یعنی دونوں متوازی (Parallel) وجود پذیر ہوئے تو انسان کا بچہ ابتدا میں عقل اور بدن ہر دو لحاظ سے کمزور اٹھنے بیٹھنے بلکہ حرکت کرنے سے عاجز، گردوپیش سے بالکل بے خبر، تمیز اشیاء سے نابلد یہاں تک کہ ماں کا دودھ پینے کا بھی شعور نہیں رکھتا۔ اُسے سکھانا پڑتا ہے، مگر پھر وہ صاحبِ قوت اور صاحبِ غلبہ بن جاتا ہے۔ اس وقت جو دنیا میں تعمیرات و ایجادات کی بھرمار ہے، اسی کے شعور و عقل کا نتیجہ ہیں، جبکہ اس کے مقابل بندر کا بچہ پیدا ہوتے وقت ہی کافی حرکت پر قادر ہوتا ہے، اپنی ماں کی چھاتی منہ میں لے لیتا ہے، ایذا رساں چیزوں سے بچتا اور نافع چیز کو لے لیتا ہے، انسان کا بچہ اپنی سرین پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہوتا کہ وہ اپنا رزق تلاش کرنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اے اہلِ سائنس! اگر آپ نظر انصاف سے غور کریں تو آپ کو یہ امر بخوبی ظاہر ہوجائے گا کہ انسان اور بندر کی صرف صوری مشابہت اتنے عظیم فرق کا جو اُن دونوں میں پایا جاتا ہے، جس کا ہم نے ابھی بیان کیا، ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتی، خدا تعالیٰ ہمیں اور آپ دونوں کو امر صواب کی

ہدایت دے۔"[1]

ایک ہی جد سے نکلی ہوئی دو انواع میں یہ فرق، غیر فطری ہے، پھر ہم جانتے ہیں کہ کرۂ ارض پر کوئی بھی دوسری نوع انسان ایسے مرتبہ و مقام کی حامل نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالنا، غیر منطقی نہیں کہ یہ نوع کسی اندھے ارتقا کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی ماہر ترین خالق کی تخلیق ہے، تخلیق کی پیچیدگی اور فعلیت ہر دو اس حقیقت پر گواہ ہیں۔ چنانچہ کمیونسٹ روس کے دور میں مصنّفین جو انسان کو اسی ارتقاء کا نتیجہ خیال کرتے ہیں، کتاب "انسان بڑا کیسے بنا؟" کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"کرۂ ارض پر ایک عظیم ہستی ہے۔

اس کے ہاتھ ایسے ہیں کہ وہ آسانی سے انجن اٹھا لیتے ہیں۔

اس کے پیر ایسے ہیں کہ وہ ہزاروں میل کا راستہ ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔

اس کی آنکھیں ایسی ہیں کہ غائب چیز کو دیکھ سکتی ہیں اور کان ایسے ہیں کہ دنیا کے دوسرے سرے کی بات سن سکتے ہیں۔

یہ ہستی اتنی طاقت ور ہے کہ پہاڑوں کے اندر سرنگیں بناتی ہے اور آبشاروں کو ہوا میں معلق کر دیتی ہے۔

وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کے خدوخال بدل رہی ہے، جنگل لگا رہی ہے، سمندروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے، ریگستانوں کو سیراب کر رہی ہے۔

یہ عظیم ہستی کون ہے؟

انسان۔

لیکن وہ عظیم کیسے بن گیا، کرۂ ارض کا مالک کیسے بنا؟

اس کتاب میں ہم یہی بتانا چاہتے ہیں۔[2]

---

[1] سائنس اور اسلام، ص ۲۰۶۔

[2] انسان بڑا کیسے بنا از میخائل ایلین اور ایلینا سیگال۔

اصولِ اوّل اور انبیاء کرام کا گروہ:

اگر انواع کی تعداد تقریباً 25 لاکھ ہے تو پھر یہ اعزاز صرف حضرت انسان کے حصے میں کیوں آیا؟

مادی یا مشینی ارتقا میں روح وروحانیت ایسے الفاظ اجنبی ہیں۔ اس طرح یہ کسی نصب العینی ، غایتی یا اقداری وجود کے تصور سے یکسر عاری ہے جبکہ انسانی عمل میں اس کا اس قدر عمل دخل ہے کہ انسان نصب العین پر جان قربان کردینے کو اعزاز خیال کرتا ہے اور یہ تمام انواع میں سے انسان کا ہی اعزاز ہے اور سب سے حیران کن امر یہ کہ انسان ''غیب'' کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے، نامعلوم سے تعلق کے لیے جس قدر ذہنی سرگرمی انسان نے دکھائی یہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل کہ وہ کوئی ایسا داعیہ رکھتا ہے جو اس کی انفرادیت کو متعین کرتا ہے۔ ماورائے مادہ تفکر کہ یہ اہلیت ازل سے انسان میں موجود ہے تاہم وہ اپنی اس اہلیت کی بنا پر کسی ''اصولِ اوّل'' کو معلوم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس طلبِ انسانی کو پورا کرنے کے لیے ،انسانوں میں سے ایک مقدس گروہ اٹھایا گیا۔

یہ مقدس گروہ جسے اصطلاحاً ''انبیاء'' کہا جاتا ہے، زمانی ومکانی لحاظ سے نہایت بُعد کا حامل ہے مگر مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر ظہور پذیر ہونے کے باوجود وہ حقیقت تک رسائی کا دعویٰ دار رہا اور ہر نبی نے اپنے عہد کے انسانوں کو بس ایک ہی بات بتائی کہ اس کائنات اور خود تمھاری حیات کی تخلیق، نہایت بامقصد ہے اور ایک خالق کو قوتِ تخلیق کی مرہونِ منت ہے جو تمھارا ''الٰہ'' ہے۔ ہمارا اِس ''الٰہ'' سے رابطہ ہے اُسی نے ہمیں تمھاری رہنمائی کے لیے بھیجا ہے تم اُسے اُس کی تخلیق یعنی حیات وکائنات اور اس کے نظم وانتظام سے پہچان سکتے ہو، اب اگر تم اُس کو پہچان کر اُس کی مرضی ومنشا کے مطابق یہ زندگی بسر کروگے تو تمھیں ایک ابدی زندگی میں راحت وآرام ملے گا بصورتِ دیگر اس کی نافرمانی میں سزا وعذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تخلیق کے یہی دو تصورات ہیں جو ممکن ہیں، یعنی بے خدا اور باخدا تخلیق، تیسرا کوئی

تصور نہیں ہوسکتا، مگر یہ بات غلط طور پر فرض کر لی گئی ہے کہ سائنس اور خود ڈاردن اور لامارک وغیرہ تخلیق وارتقاء کو بے خدا تصور کرتے ہیں۔ سائنس کا کبھی بھی یہ ادعا نہیں رہا وہ تو صرف موجود کی سائنسی تشریح کی جستجو کرتا ہے۔ اِسی طرح ''بگ بینگ'' بھی ایک دخانی گولے میں دھماکہ اور نتیجہ کے طور پر یہ کائنات کی تشکیل کی وضاحت کرتا ہے، حیات اور کائنات کو بے خدا قرار دینے والے فلسفی ہیں جو اس سائنسی مواد کو اپنی دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ مواد نفی اور اثبات ہر دو طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔

سائنسی معلومات کو فلسفہ میں استعمال کرنے کی ایک مثال دیکھیے: ''جدید ہیئت کے انکشافات کے پیشِ نظر اس بات کو تسلیم کرنا نہایت مشکل ہے کہ یہ بے کراں کائنات انسانی ذہن کی پیداوار ہے یا اس کے پس پردہ کوئی ذہن یا موضوع کارفرما ہے، جو انسانی موضوع یا ذہن سے واحد الاصل ہے؟'' [1]

سائنسی تحقیق اور کائناتِ ارضی:

مندرجہ بالا تحریر سائنسی مواد کے منفی استعمال کی واضح مثال ہے، ہمارے عہد میں سائنس نے سب سے زیادہ ترقی اور انکشافات علم ہیئت (فلکیات) میں کیے ہیں اور یہ اس قدر حیران کن ہیں کہ انسانی فہم ان کو قبول کرنے سے عاجز ہے، یہ کائنات صرف بے کراں ہی نہیں بلکہ مسلسل پھیلتی چلی جارہی ہے۔ اب چونکہ یہ بے حد وحساب پھیلاؤ کسی طاقت کے تخلیق وکنٹرول سے باہر ہے لہٰذا بقول فلاسفر مذکور اس کے پس پردہ کوئی ذہن یا موضوع (خدا) کارفرما نہیں۔ اس کے برعکس گورنمنٹ کالج سرگودھا کی لائبریری میں کسی ملتان کے پیر صاحب کی ایک کتاب تھی، جس میں انھوں نے اسی بیکراں اور پھیلتی کائنات (Expanding Universe) کے لیے موضوع (خدا) کو ضروری قرار دیا ہے۔ اتنا بڑا نظام بغیر منتظم کے، صرف ایک دفتر کا نظام منتظم کے بغیر نہیں چل سکتا۔

غور فرمائیے! انسانی ذہن کس درجہ کم مائیگی کا شکار ہے کہ وہ قیاسِ مثل سے نکلنے کی

[1] روایاتِ فلسفہ، علی عباس، جلال پوری، ص ۷۷۔

طاقت نہیں رکھتا چونکہ کائنات بے حد وحساب وسیع ہے اور وسیع تر ہوتی چلی جارہی ہے لٰہذا کسی میں اتنی قوت کا ہونا ناممکن ہے کہ وہ اس کو کنٹرول کرسکے۔ لہٰذا اس کے پس پردہ کوئی ذہن یا موضوع (خدا) نہیں ہوسکتا۔ جبکہ یہ کس قدر فطری بات ہوگی کہ ایک بے انتہا قوتوں کا مالک خدا اس کا تخلیق کار اور منتظم ہے اور جس پر لاتعداد گواہ موجود ہیں محض قیاس نہیں۔

انسان کے اس رویے میں بھی اس کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ مجردات میں تفکر کی اہلیت رکھتا ہے اور مفروضات قائم کرتا ہے، اس بات کی وجہ سے انسان کو الزام نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی "اصولِ اول" کا انکار کیوں کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطری مجبوری ہے کہ وہ "عقلی توجیہہ" کا متلاشی رہتا ہے اور حواس کا اسیر ہے۔

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
ماننا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

شعور کی اس سطح پر کوئی دوسری نوع نہیں وہاں ارادہ واختیار کے فقدان کے باعث اقرار وانکار کا سوال ہی نہیں اٹھایا جاتا، نہ کسی فکری طلب کا کوئی سوال اٹھتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی اس فطری طلب اور مجبوری کے تحت کائناتی معمہ کو حل کرنے کے لیے ہر دور میں سرگرداں رہا۔

فکر انسانی اور تخلیق کائنات:

طالیس ملطی وہ پہلا فلسفی تھا جس نے عقلی بنیاد پر تخلیقِ کائنات کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا کہ کائنات کا مبداء "پانی" ہے۔ انا کسی مینڈر 'مرطوب عنصر' کو حیات کی بنیاد قرار دیتا ہے اور انسان کی ابتدا مچھلی سے کرتا ہے، ہرکلیتس کے نزدیک مبداء "آگ" ہے۔ ایمپیڈوکلیز "عناصر اربعہ" کو کائنات کا مبداء قرار دیتا ہے، غرض تمام فلاسفر ایک عقلی توجیہہ پیش کرتے ہیں مگر آپ ذرا غور کریں تو یہ تمام محض "قیاس" کے سوا کچھ نہیں نیز "موجود" سے ماورا کے تصور سے انسان کبھی جان نہیں چھڑا سکا۔

چنانچہ فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ جو اصطلاحاً "مثالیت پسند" کہلاتا ہے، ہمیشہ حقیقت کو

''ماورائے مادہ'' تلاش کرتا ہے اور اسے اصولِ اول کے طور پر تخلیق و نظم کائنات کے لیے قبول کرتا رہا۔ فیثاغورس جو عارفی مت کا پیروکار تھا، ''بقائے روح'' اور ''تناسخ ارواح'' کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ ''ہمارا آقا خدا ہے'' پارمی نائدلیس الیاطی، اصولِ اول کو ''وجود'' سے تعبیر کرتا تھا اور یہ وجود ''احدیت'' ہے۔ وہ ایک لحاظ سے وحدت الوجود کا قائل تھا کہ اس کے نزدیک ''کائنات خدا ہے'' سقراط کو بت پرستی سے نفرت تھی اور وہ ایک خدا کو مانتا تھا۔ افلاطون حقیقت کو ماورائے عالم ''عالم امثال'' میں دیکھتا ہے، ارسطو کے یہاں یہی ''امثال'' (Ideas) ہیئت (Form) ہے یعنی 'مثل' اور 'مادہ' یکجا ہیں اور ہیئت مطلق کو وہ خدا کہتا ہے۔ جدید فلاسفہ میں جارج برکلے نے سرے سے ''مادہ'' کا انکار کر دیا اور ''ذہن'' کو اصل قرار دیا۔ عمانویل کانٹ بھی عقلی استدلال سے حقیقت کی یافت کو ناممکن قرار دیتا ہے اور ایک اخلاقی وجدان کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ بعد میں اس کے اثرات فشٹے، شیلنگ اور ہیگل میں ظاہر ہوئے جو حقیقت اولیٰ کو ''شعور'' میں دیکھتے ہیں اور ''وجود مطلق'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہیگل نے کائنات کو شعور کا ارتقاء قرار دیا۔

فلسفی مکاتبِ فکر:

مندرجہ بالا تحریر میں فلاسفہ کے نظریات کا محض سرسری تذکرہ کیا گیا۔ جس سے یہ بات بہرحال واضح ہو جاتی ہے کہ فلسفہ میں ابتدا ہی سے دو مکاتبِ فکر یعنی مادیت پسندی اور مثالیت پسندی، کائناتی اصولِ تشریح کے طور پر موجود رہے۔ اول الذکر کے نزدیک کائنات کی اساس 'مادی' جبکہ مؤخر الذکر کے نزدیک کائنات کی اصل روحانی یا ذہنی ہے۔ بلاشبہ فلاسفہ کی کاوشیں اپنی جگہ تاریخِ فکر و نظر کی روشن روشیں ہیں اور عقل کو حقیقت کی کنہ دریافت کرنے سے باز رکھنا جہالت ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فلسفہ اپنی معلوم تاریخ میں کسی اصولِ اوّل کی دریافت میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ کوئی ایسا قابلِ عمل نظام واضح کرنے میں کامیاب ہوا جس سے فرد کی انفرادی یا اجتماعی زندگی ایک مربوط و منظم کل میں تشکیل پا سکے۔ چنانچہ اگر تعصب رکاوٹ نہ بنے تو یہ بات برملا کہی

جاسکتی ہے کہ فلسفہ کی معلوم تاریخ نارسائی کا المیہ ہے۔

قاضی قیصر الاسلام رقمطراز ہیں:

''الغرض اِس حقیقت کو عام طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے کہ عقل بھی کسی ''اصولِ اولیٰ'' کی دریافت میں ناکامی کا شکار ہوچکی ہے۔'' ❶

لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا تعصب رکاوٹ نہ بنے تو اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں مگر انسان تعصب سے مبرّا ہونہیں سکتا اور صاحبِ مضمون نے بھی اِس کا حوالہ دیا ہے کہ منطقی اثباتیت Logic Positirism کے حوالے سے:

''ہمارے ادیب، دانشور اور خطیب (Emotional Black Mailing) کرتے ہیں یا یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ (In Tellectual Black mialing) عام ہوگئی ہے۔''

مضمون نگار نے جس (Black Mialing) کا ذکر اپنے لوگوں کے حوالے سے کیا ہے اس کے بارے میں تو اپنے لوگ بہتر سمجھتے ہیں تاہم منطقی اثباتیت جس کا تذکرہ کیا گیا ،بذاتِ خود حقیقت کے راستے کا روڑا ہے۔

منطقی اثباتیت (Logic Positirism) بنیادی طور پر فلسفہ کی نارسائی اور نتیجہ کے طور پر ناکامی کا ردِ عمل ہے۔ اس فلسفہ نے سرے سے پوری مابعد الطبیعیات کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ ''حسّی تصدیق سے ماوراء کسی شے کے ہونے کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ نیز مابعد الطبیعیات ایک طرح کی (Intellectul Black Mailing) ہے جس کو زبان کے غلط استعمال سے تسلیم کروا لیا جاتا ہے کیونکہ ذہنِ انسانی، لسانی ساخت میں کچھ اس طرح اسیر ہے کہ وہ اِس قسم کے مغالطوں یا فریبوں کو شناخت نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر ایک فقرہ لیں کہ ''میز موجود ہے'' یہ فقرہ ہماری ذہنی ساخت میں موجودگی کے تصور کو ابھارتا ہے اور ہم حواس سے اس کی تصدیق بھی کرسکتے ہیں گویا یہ موجودگی حقیقی ہے مگر اسی ذہنی لسانی

❶ فلسفہ کے بنیادی مسائل، ص ۱۰۱۔

ساخت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چالاک لوگ اپنے مخصوص مفادات کے لیے اس فقرہ سے ''میز'' کا لفظ نکال کر ''خدا'' کا لفظ رکھ دیتے ہیں اور فقرہ بن جاتا ہے کہ'' خدا موجود ہے۔'' یہ محض لسانی دھوکہ ہے ورنہ اس فقرہ کی تصدیق ہمارے حواس ہرگز نہیں کر سکتے مگر چونکہ لسانی ساخت میں یہ موجودگی کے تصور کو ابھارتا ہے، لہٰذا یقین کر لیا جاتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ چنانچہ منطقی اثباتیت بقول روڈلف کارنپ بہت ساری دوسری مابعد الطبیعیات اصطلاحات کو بھی بے معنی قرار دیتی ہے:

''...... مابعد الطبیعیات کی بہت سی دوسری اصطلاحات بھی معنی و مفہوم سے عارضی ہیں۔ مثلاً تصور، مطلق، غیر مشروط ،لامتناہی، ہستی، وجود، عدم، شئے بالذات، لوحِ مطلق، معروضی ذات، جوہر، وجود بالذات، وجود برائے ذات، صدور وغیرہ۔'' ❶

منطقی اثباتیت، شدید تنقید کی زد میں رہی ہے تاہم یہاں اختصار کے پیشِ نظر کاپلسٹن (copleston F.C) کی کتاب ''عصری فلسفہ'' سے یہ ایک اعتراض ہی اِسے رد کرنے کے لیے کافی ہے کہ:

''یہ کہنا کہ صرف وہ جملے بامعنی ہیں جن کا ادراک حواس کے ذریعے ہوسکتا ہے، صحیح ہے، تو پھر آخر کون سے حواس ہیں جو اس جملے کے بامعنی ہونے کا تعین کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہمیں حواس سے کبھی بھی اس بات کی صداقت کا ادراک نہیں ہوسکتا کہ صرف وہ جملے بامعنی ہیں جن کا ادراک حواس سے ممکن ہے۔'' (ایضاً، ص ۲۸۸)

یہاں تھوڑی دیر رک کر ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ''حقیقت کیا ہے؟'' حقیقت کی ایک سادہ سی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ:

''حقیقت (reality) وہ شے ہے جو کسی ایسے تغیر کو قبول نہ کرے جس کے نتیجہ

❶ فلسفہ کے بنیادی مسائل، قاضی قیصر السلام، ص ۲۸۵۔

میں اُسے اپنے اساسی خواص سے دست بردار ہونا پڑے۔“

اس اصول کی رُو سے ”مادہ“ (Matter) ”حقیقت“ تھا۔ چنانچہ فلسفہ اور سائنس کائنات کی مادی تعبیر کرتے رہے اور وہ اس میں اپنے اصول وتجربہ کی بنیاد پر حق پر تھے۔ اِس فلسفہ کو سائنس کی وجہ سے ”مثالیت پسندی“ پر برتری حاصل تھی۔ کیونکہ ”مادہ“ اپنے آخری تجزیہ میں ”ایٹم“ (Atom) تھا اور ایٹم گو کہ نادیدہ (Unvisible) ذرہ (Portical) تھا، جسے خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا، صرف اپنے حوالی میں اثرات سے محسوس کیا جاسکتا تھا، مگر یہ مادی خواص یعنی کثافت، وزن اور صلابت کا حامل تھا۔ چنانچہ 18 ویں صدی تک سائنس دان اور اُن سے حاصل کردہ مواد کی بنیاد پر فلسفہ کسی ”غیر مادی وجود“ کو قبول نہیں کرتا تھا تو اس میں وہ تجربی بنیاد پر حق بجانب تھا۔

مادہ، مادیت اور سائنسی فکر:

مگر پھر ایک ایسا حادثہ ہوا کہ جس نے معلوم تاریخ سائنس اور فلسفہ کے تمام مادی تصورات کو باطل کردیا ہوا یہ کہ ردرفورڈ نے ۱۹۱۳ء میں ایٹم توڑ دیا۔ یہ تاریخ کا اتنا بڑا حادثہ یا واقعہ تھا جس نے کائنات کی اساس ہی بدل ڈالی، چنانچہ الیکٹرون، پروٹان، نیوٹران سے ہوتے ہوئے ایٹم 102 اجزاء (Particuls) میں تقسیم ہوگیا اور پھر اِس پر بس نہیں بلکہ یہ توانائی (Energy) میں بدل گیا۔ توانائی غیر مادی ہے، وزن رکھتی ہے، نہ جگہ گھیرتی ہے ،نہ دکھائی دیتی ہے۔ گویا یہاں پہنچ کر حقیقت (Reality) کا مادی تصور ٹوٹ گیا اور مادی الاصل کائنات کے حامل تمام فلسفے غلط ہوگئے۔

مادہ (Matter) کے اس اساسی تغیر نے، مثالیت پسندی اور مذہبی فکر کو تقویت بخشی، سائنس کا ادّعا ہرگز نہیں کہ وہ کسی مابعد الطبیعیاتی اصول کو ثابت کرے، نہ وہ مذہبی فکر کے معروض (Object) کو ثابت کرنے کا داعیہ رکھتا ہے ،اس تعبیر نے دراصل اس اساس کو توڑ دیا، جس سے غیر مادی وجود (روح یا خدا) کا انکار کیا جاتا تھا، اب سائنس کے حوالے سے ”غیر مادی وجود“ کا انکار ممکن نہ رہا۔

تو کیا توانائی اساس کائنات یا توانائی اصل کائنات ایک حقیقت ہے اور یہ کہ توانائی کی صورت میں ہمیں حقیقت اس تصور یا تعریف میں حاصل ہوگئی ہے جسے اساسی سطح پر ناقابلِ تغیر قرار دیا گیا تھا؟ نہیں، ایسا نہیں ہے، توانائی گوکہ غیر مادی ہے، مگر اپنی اس غیر مادی اساس کو ترک کر کے دوبارہ مادہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی Inter Convertible ہے۔ گویا ہمارا مسئلہ کہ حقیقت کیا ہے؟ ابھی وہیں ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔

فلسفہ میں آپ نے دیکھا کہ اصولِ اول کے لیے مختلف نام تجویز کیے گئے۔ اِسی طرح مادی اساس فلسفوں نے مختلف عناصر کو اساسِ کائنات قرار دیا، مگر یہ تمام تر ذہنی وفکری جدوجہد، لائقِ تحسین ہونے کے باوصف، ظن وتخمین سے زیادہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی دو فلسفی کائناتی تشریح کے کسی اصول پر متفق نہیں، رہا سائنس تو اِس کا یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر سائنس اپنی نارسائی کا برملا اعتراف کرتا ہے۔ جس کو صاحبِ مضمون نے ایک دوسرا رنگ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”جدید طبیعیات کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ (Heisenberg's Uncertainty Principal) کے باعث سب کچھ امکانی یا احتمالی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی عمارت بھی حتمی بنیاد نہ رکھے......“

بنیاد کی نفی پر اصرار اور پھر اُسے غیر ضروری قرار دینے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سائنس کے پاس کوئی اصولِ تشریح حقیقتِ اولیٰ کے لیے موجود نہیں، چنانچہ صاحبِ مضمون نے ہائزن برگ (Heisenberg) کے جس اصولِ عدم تعین (Law of uncertainty) کا حوالہ دیا ہے وہ واضح طور پر اِس بات کو ایک اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ ہم بیک وقت الیکٹرون کی حرکت (Momentum) اور مقام (Position) کا تعین نہیں کر سکتے۔

پروفیسر حمید عسکری لکھتے ہیں:

> ”اصول سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ کسی ایک تجربے میں روشنی کی دونوں صورتیں یعنی موج اور ذرے کی صورت ایک ساتھ کیوں نظر نہیں

آتیں؟ اگر کسی تجربے میں الیکٹرون اپنی موجی کیفیت ظاہر کرتا ہے تو اس کے ذرے جیسی کیفیت ماند پڑ جاتی ہے اور اگر کسی تجربے میں الیکٹرون اپنے ذرے والی خصوصیت ظاہر کرتا ہے تو موجی کیفیت دھندلا جاتی ہے، دونوں خصوصیات کو ایک ہی وقت میں دیکھنا ممکن نہیں۔'' ❶

یہ اصول غیر یقینی (Untcertainty) اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات ہمیں اپنی مکمل تشریح کی اجازت نہیں دیتی اور اس بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ دریافت کا عمل ابھی تک پایۂ تکمیل نہیں پہنچ سکا، جولائی ۲۰۱۲ء میں جینوا کی تجربہ گاہ ''سرن'' میں ایسا ذرہ دریافت ہوا ہے جسے اس وقت تک دریافت شدہ ذرات میں سب سے چھوٹا بتایا گیا ہے اور اسے اس صدی کی سب سے بڑا دریافت قرار دیا جارہا ہے، آپ حیران ہوں گے کہ یہ ذرہ اڑتالیس سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ایک امریکی سائنس دان ہگن بوسن نے اس پر کام شروع کیا تھا اور ۲۰۱۲ء میں یہ ذرہ دریافت ہوا۔ چنانچہ اس ہگن پارٹیکل کا نام دیا گیا۔ بعض سائنس دان اسے خدائی ذرہ (Portical God) بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ دریافت انسانی شعور وخیال سے ماورا ہے۔ کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ یہ تجربات کامیاب بھی ہوسکتے ہیں، دریافت کے عمل کی تکمیل کی گواہی اس لیے بھی نہیں دی جاسکتی کہ آئن سٹائن کے بقول کائنات پھیل رہی ہے یعنی (Expanding Universe) ہے اس پر مستزاد (Black Matter) کے تصور نے کہ تقریباً ۹۴٪ کائنات بلیک میٹر سے بنی ہوئی ہے اور روشنی کی شعاعوں کو چونکہ وہ منعکس نہیں کرتا اس لیے ناقابلِ دید ہے۔ کائنات کی پُراسراریت میں اضافہ کردیا ہے، غرض کائنات کے بارے میں کوئی بھی تصور کسی یقین تک رسائی میں ممدومعاون نہیں، حیات کے بارے میں پہلے ہم یہ جان چکے ہیں کہ ڈارون نے اِسے محض ایک اتفاق بتایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کا یہ ہرگز مقصد نہیں تھا کہ وہ حیات کی ابتدا کی کوئی توجیہہ کرے، وہ تو سمندری سفر کے دوران مختلف جزیروں پر ملنے

---

❶ جدید طبیعات، ص ۱۷۷۔

والے فوسل اور بعض دوسرے سائنس دانوں کے خیالات کے پس منظر میں ارتقاء کا ایک تصور پیش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ حیات کی ابتدا کے بارے میں کوئی قابلِ قبول تصور سائنسی حوالے سے موجود نہیں اور حیات از حیات کے سائنسی اصول نے تو یہ بات تقریباً بلکہ قطعاً مسترد کردی ہے کہ حیات بغیر کسی حیات کے خود بخود پیدا ہو سکتی ہے، یوں گویا سائنس ہمیں ہر دو مسائل پر ایک بند گلی میں چھوڑ آتا ہے۔

تو پھر حیات و کائنات کا راز کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سائنس ہمیں کسی منزل کا پتا نہیں دیتا، جس طرح فلسفہ ایک اصولِ اول یا علت اولی (First Cause) کی بات کرتا ہے کیونکہ تخلیقِ کائنات اور نظمِ کائنات اور اس کا تسلسل کسی ''اصول'' کو طلب بھی کرتے ہیں مگر محض عقلی حوالہ سے کسی منزل تک رسائی ممکن نہیں۔ بقول علامہ اقبال: ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

سائنسی تر درتج اور علم وحی:

بالکل اِسی طرح سائنس اب ہمیں مادہ سے نکال کر غیر مادہ تک لے جاتا ہے۔ مگر یہ غیر مادہ کہاں سے آ گیا؟ اس کی توجیہہ سے وہ قاصر ہے۔

دوسری تمام انواع (جن کی تعداد 25 لاکھ بتائی گئی ہے) کے برعکس انسان مادی طلب کی تسکین پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بعض حالات میں اس کی شعوری طلب، اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ مادی طلب کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ یہ رویہ انواع میں انسان کی انفرادیت کا تعین کرنے کے علاوہ اس علمی و سائنسی ترقی کی بنیاد ہے جس کے مظاہر یا عجائبات، آج قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ مگر اس تمام کے باوصف وہ ایسے شعور کا اسیر ہے جو حیات و کائنات کی کُنہ (حقیقت) دریافت کیے بغیر مطمئن نہیں ہوتا، اب جبکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی علوم، انسان کی اس طلب کی تشفی سے قاصر ہیں تو پھر آخر ہمارے پاس اس طلب کے لیے کوئی اور ذریعہ رسد بھی ہے؟

جی ہاں! انسانوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک اور ذریعۂ علم کی بات کرتا ہے اور وہ ''علم وحی'' ہے۔ حیران کن حد تک انسانوں کے اس گروہ کا رویہ دوسرے تمام انسانوں سے مختلف ہے۔ یہ نہ تو فرضیت کی بات کرتے ہیں نہ ظن وتخمین اور قیاسات، امکانات پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ مختلف زمانی اور مکانی، ادوار اور مقامات کے تمام کے تمام (جن کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے) ایک ہی دعویٰ کرتے ہیں اور پورے یقین و اعتماد سے کرتے ہیں، اس قدر یقین واعتماد سے کہ اگر ان کو جان ومال، عزیز واقارب اور مقام ووطن کی قربانی دینی پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرتے اور پھر ایک اور مزید حیران کن امر یہ کہ وہ اس عمل میں اپنے لیے کسی دنیوی مال ومنفعت کی طلب نہیں رکھتے بلکہ اس کے بالکل برعکس دنیا میں بھی ایثار و قربانی کرتے ہیں اور ایک ایسی حیات مابعد کی خبر دیتے ہیں جہاں نعمتوں کی فراوانی ہوگی۔ اس ساری تگ ودو اور کدّ وکاوش میں اُن کی کسی طرح کی ذاتی ضرورت اور طلب شامل نہیں بلکہ اس میں وہ انسانوں کی کامیابی اور ایک دائمی بھلائی اور خیر کی خبر دیتے ہیں۔

ترقی پذیر کائنات اور انبیاء کے فرمودات:

انسانوں کا یہ گروہ جو اصطلاحاً پیغمبر یا انبیاء کہلاتا ہے، ایک ایسا اعلیٰ اخلاقی رویہ رکھتے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ تمام اخلاقی رذایل سے یکسر پاک اور اس درجہ اعلیٰ مرتبے کے حامل کے دشمن بھی اُن کی صداقت و امانت کی گواہی دیتے ہیں۔ کوئی غرض یا خوف اُن کو اس دعویٰ سے دست بردار نہیں رکھ سکتا اور نہ کسی ظلم وجبر کے سامنے وہ ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ انتہا یہ کہ پورے معاشرے کے مقابل وہ تنہا بھی کھڑا ہوکر اپنے دعویٰ کا اعلان کرتے اور طاقت ہوتو مقابلہ کرتے ہیں ورنہ ظلم وجور پر صبر کرتے ہیں اور جوانمردی سے برداشت کرتے ہیں۔ غرض یہ گروہِ انبیاء ہر لحاظ سے مثالی ہے۔

اپنے یقینی علم کی بنیاد پر ان کا دعویٰ زمان ومکان کے بے انتہا اختلافات کے باوجود صرف اور صرف ایک اور صرف اتنا سا ہے کہ ''لاالـه الا الـلـه'' یعنی جملہ مراسم عبودیت کا

معروض (Object) صرف ایک ''اللہ'' ہے۔ یہی اللہ حیات وکائنات کی تخلیق کا اصولِ اول ہے اور یہ اِس کے نظم وتسلسل کا ''ناظم'' ہے اور یہ تخلیق بامقصد ہے، بلاشبہ انسان کو عقل وشعور عطا کیا گیا ہے مگر انسان اپنے مادی احوال میں اسیر ہے، چنانچہ وہ ماورائے مادہ کسی 'اصولِ اول' کی کلی شناخت نہیں کرسکتا، وہ تخلیق سے خالق اور نظم سے منتظم کے وجود پر دلالت قائم کرسکتا ہے، مزید تائید اُسے وحی الٰہی سے دی گئی تو اب اُسے اسی امتحانی نوعیت کو قبول کرکے اپنے طرزِ عمل کو اِس ضابطہ وقانون کے تحت لانا چاہیے جو اُس کے خالق کا منشا ہے، یہی مقدس گروہ حیات کے ایک ایسے تسلسل کی خبر دیتا ہے۔ جس پر انسانی علوم کوئی قطعی وحتمی دلیل قائم نہیں کرسکتے۔ یہ خبر حیات مابعد کی ہے، جو دراصل اس امتحانی کیفیت کا اختتام اور انعام ہے۔

اِس دعویٰ پر ایک اور دلیل اُن کا اپنا کردار ہے۔ ایسا کردار جس پر دشمن بھی انگلی نہیں اٹھاسکتے بلکہ صادق و امین قرار دیتے ہیں اور اپنے اپنے عہد کا بہترین انسان قرار دیتے ہیں۔ ہر عہد کے انسانوں نے نبی کے کردار وعظمتِ کردار کی گواہی دی ہے مگر الوھیت کا انکار کرتے رہے، گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے نہیں ''توحید'' سے دشمنی تھی اور اس دشمنی کی واحد بنیاد قوت وطاقت کے اُس ارتکاز کی نفی تھی جس کا تقاضا ''الٰہ'' کرتا ہے۔ کیونکہ اس ارتکاز کے نتیجہ میں غیر اللہ سے طاقت کی مکمل نفی ہوجاتی ہے۔ یہ کتنا عجیب رویہ ہے کہ دلیل (صداقتِ کردار) کو مانا جائے اور دعویٰ (الوھیت الٰہ واحد) کو جھٹلایا جائے!

حیات وکائنات کی اس ربانی توجیہہ پر ایک اور دلیل انبیاء علیہ السلام کی تعلیمات ہیں۔ یہ کتنی عجیب وغریب بات ہے کہ تمام انبیاء اُمّی یعنی اَن پڑھ تھے۔ یہ فضیلت صرف انبیاء ہی کو حاصل تھی اور یہ ایک طرف تو اُن کو انسانی علم کی محتاجی سے نکالتی ہے اور دوسری طرف اُن کے علم کے لیے کسی دوسرے واسطے کو لازم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ انبیاء علیہ السلام نے اَن پڑھ ہونے کے باوجود وہ علوم ومعارف بیان کیے ہیں کہ

بقول جگر مراد آبادی ؎

ایسے تھے آپ اُمّی کھولی زبان جس دم
دم بھر میں بے زباں تھے سارے زبان والے

نبی آخر الزمان اور تدریجی مراحل

اِس وقت جبکہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ اختتام پذیر ہوجاتا ہے اور محمد ﷺ آخری نبی کی حیثیت سے دائمی طور پر مطاعِ انسانیت قرار دیے گئے ہیں کہ اُن کی تعلیمات قرآن وحدیث سے، اس دعویٰ الوھیت الہ واحد کی تصدیق ممکن ہے۔ بہت سارے افراد نے سائنس کے حوالے سے بھی کام کیا ہے۔میں یہاں صرف موریس بکاییئے کا حوالہ دوں گا۔ اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں انھوں نے بہت ساری دوسری باتوں کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ جدید سائنسی علوم کے حوالے سے قرآن کا ایک بیان بھی غلط ثابت نہیں ہوا اور جن علوم کا قرآن میں ذکر ہے، یہ محمد ﷺ کے زمانے میں دنیا کے کسی خطہ میں موجود نہ تھے اور بعض تو ابھی حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں جیسے بچے کی تخلیق اور پیدائش کا عمل۔گویا علمی لحاظ سے بھی انبیاء کی یہ تعلیمات، انسانی شعور کی تشفی کرتی ہیں۔ چنانچہ خود قرآن حکیم بار بار انسانی شعور کو اپیل کرتا ہے اور کائنات اور خود حیاتِ انسانی و حیوانی پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

کائنات کی حقیقت اور دخان:

قرآن حکیم ہی سے ہمیں ایک اور ایسی حقیقت کا علم ہوتا ہے جس سے سائنس گزشتہ صدی میں آشنا ہوئی۔جس کے تحت ابتدائی حالت میں کائنات ایک گیسی مادہ کی شکل میں تھی، قرآن حکیم نہایت واضح انداز میں اِسے ''دخانی حالت'' سے تعبیر کرتا ہے کہ:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَآ أَتَيْنَا طَآئِعِينَ ۝﴾ [1]

[1] حم السجدة: ٤١/ ١٠.

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا، اس نے آسمان و زمین سے فرمایا ''وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا ہم آ گئے، فرمانبرداروں کی طرح۔''

چنانچہ یہ دخانی یا دھویں کی حالت، پوری کائنات کی تھی اور سائنس بھی اس حالت کو تسلیم کرتی ہے، پھر سائنس ہی نے مادہ کو غیر مادی حالت میں لا کھڑا کیا ہے تو پھر یہ قیاس کرنے میں کوئی شے مانع نہیں کہ دخانی کیفیت بھی ایک ارتقائی حالت ہے۔ اس سے قبل کائنات کو توانائی الاصل قرار دینے میں کوئی چیز مانع نہیں، توانائی (Energy) کی اس اولیت، غیر مادی حالت اور ہمہ گیریت کی وجہ سے بعض لوگ توانائی کو ہی 'خدا' قرار دینے لگے جو دراصل سائنسی وحدت الوجود ہے۔ مگر دو بنیادی وجوہات کی بنا پر یہ خیال غلط ہے:

① توانائی غیر مادی ہے مگر ارادہ و شعور سے عاری ہے۔

② توانائی اپنی اصل پر قائم نہیں رہتی، دوبارہ مادی حالت کو قبول کر لیتی ہے۔

جبکہ انسان ارادہ و شعور کی حامل مخلوق ہے، وہ اعلیٰ شعور کے ساتھ کائناتی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذہنی تشفی اور تسکین کو اُسی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ ضروری خیال کرتا ہے جتنا مادی ضروریات کی تسکین و تشفی،لہٰذا انسانی فکری رویہ معروض کو ''شعور'' میں طلب کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا معروض (Object) کوئی ایسی ذات ہو، جو ارادہ و شعور کی حامل ہو اور لازماً اُس کے شعور میں اٹھنے والے سوالات اور شکوک وشبہات کی بھی تسلی بخش طریقہ سے تشفی کر سکے۔

فلسفہ مابعد الطبیعات کی حقیقت:

یہاں ٹھہر کر آپ اس بات پر بھی غور کر لیں کہ فلسفہ میں مابعد الطبیعیات کہاں سے آ گئی۔ خدا، فرشتے، جنت، دوزخ، وحی بلکہ پورا عالم بالا، انسانی عقل و شعور کے احاطہ سے باہر ہے۔ اگر آپ تاریخِ فکر کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ فلسفہ کہ اصطلاحات ''اصولِ اول'' ارادہ مطلق، عقلِ اول، وجود مطلق، عالم امثال ایسے سارے تصور دراصل

فلسفہ کو مذہب کی دین ہیں۔ یہ ساری اصطلاحات انبیاء علیہم السلام کے ''تصورِ الٰہ'' کے مختلف نام ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے فراموش کردینے یا نظر انداز کردینے سے وجود میں آئیں، ورنہ انسان محض عقلی حوالے سے مابعد الطبیعات کا اثبات کرنے سے قاصر ہے کہ اُس کے تمام قوانین، 'طبیعات' (Physics) سے اخذ کردہ ہیں۔ لہٰذا پورے مادیت پسند فلسفیوں کا، طبعی قوانین سے مابعد الطبیعات (Mata Physics) کو رد کرنا ہی غیر علمی و غیر سائنسی رویہ ہے۔

مگر بن دیکھے ماننا، غیر علمی اور غیر سائنسی رویہ نہیں، چنانچہ فلسفہ جو طویل عرصہ تک مابعد الطبیعات کا اثبات کرتا رہا اور ماورائے مادہ ''اصولِ اول'' کو تلاش کرتا رہا تو یہ انسانی شعور کی اُس سچی طلب کا شاخسانہ تھا جس کے تحت وہ کسی ارادہ و اختیار کے حامل معروض (Object) کو طلب کرتا ہے، دیکھ کر ماننے کی شرط تو دنیا کا کوئی علم نہیں لگاتا بلکہ سائنسی علوم اِس شرط کو قبول نہیں کرتے...... ایٹم آج تک کسی نے نہیں دیکھا اور پھر اس کے 102 اجزاء کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس پر طرّہ یہ کہ بکن پارٹیکل کائنات کا انتہائی چھوٹا ذرہ دریافت ہوگیا ہے مگر یہ سب دکھائی نہیں دیتے، اپنے حوالی میں اثرات سے محسوس ہوتے ہیں گویا سائنس دان بھی اثر سے موثر پر دلالت کرتا ہے، توانائی غیر مادی ہے، دکھائی دیتی ہے نہ چھوا جاسکتا ہے نہ جگہ گھیرتی ہے، بقول خواجہ میر درد ؎

جوں نورِ بصر تیرا تصور

تھا پیش نظر جدھر گئے ہم

حقیقت کی تلاش میں سرگرداں

پہلے تو شاعر کا کمال دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ جو ''لیس کمثلہٖ شئ'' ہے اور تشبیہ سے ماورا ہے۔ تشبیہ میں لے آیا ہے، یعنی اے اللہ تعالیٰ! تُو میری آنکھوں کے نور کی طرح میرے ساتھ بطور رہنما موجود رہا میں جدھر بھی گیا۔ یعنی تو ہی ہماری صراطِ مستقیم کی جانب رہنمائی کرنے والا ہے۔ اب دیکھ لیجیے کہ آنکھوں کا نور (بینائی) دکھائی نہیں دیتا مگر موجود ہے،

اسی طرح اللہ بھی موجود ہے، مگر دکھائی نہیں دیتا گویا موثر کا وجود، اثر سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دیکھنا شرطِ عبث ہے۔ غیب پر ایمان غیر عقلی نہیں جبکہ اس کی تصدیق ایک مقدس گروہِ انسانی، زمانی، مکانی بُعد واختلاف کے باوجود یکساں انداز سے کر رہا ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں اگر اسے دیکھ کر ماننے یا ''حسی تصدیق'' کے اصول کو لاگو کریں تو دوسرا قدم اٹھانا مشکل ہو جائے۔ مقامی اور عالمی اطلاعات پر ایک اعتماد کی بنا پر یقین کر لیا جاتا ہے اور رہا سائنس تو وہ ''فرض'' کو بھی مان لیتا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے تو اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں دیکھنا ناممکن ہے دوسرا اس ''غیب'' کی بنیادی وجہ امتحانی کیفیت ہے جو تخلیق کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ یا مقررہ وقت (قیامت) کو جب انسان دیکھ لے گا، امتحان ختم ہو جائے گا۔ گویا کائنات میں ''مشاہدۂ حق'' اصولِ غیب کے خلاف ہے۔

''حقیقت کی تلاش'' کا یہ سفر طویل ہو گیا۔ اس کا اختتام کرتے ہیں کہ حقیقت کی ہماری تعریف یعنی ''شے اساسی تغیر کو قبول نہ کرے'' پر نہ مادہ (Matter) پورا اترتا ہے نہ توانائی (Energy)۔ گویا انسانی علوم نظری ہوں کہ تجربی، ''حقیقت'' یا ''حقیقت اولیٰ'' (Ultimate Reality) کو دریافت کرنے سے قاصر ہیں۔ یہاں ان کی تگ ودتاز کا میدان ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں اگر انسان اپنی ''حدودِ آشنائی'' کا اعتراف کر لے تو بہتر ہے اور علمی رویہ ہے کہ وہ حس وادراک سے ماورا کسی ایسے علم سے مملو نہیں جو کسی ''غیب'' کو گرفت میں لے سکے۔ عقل کی یہ ناکامی اُس کی کمزوری نہیں بلکہ حدودِ آشنا حیثیت کو محسوس کرنا عقلی رویہ ہے چنانچہ چاہیے تو یہی تھا کہ بقول مرزا اسد اللہ غالب ؎

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

علمِ وحی اور انسانی رویہ:

مگر انسان نے بالکل غیر عقلی وغیر منطقی رویہ اختیار کرتے ہوئے حس وادراک کی بنیاد پر پوری مابعد الطبیعات کو رد کر دیا جبکہ حس وحواس یا فہم وادراک کی بنیاد پر مابعد الطبیعات کو

رَد کرنا، غیر علمی و غیر منطقی رویہ ہے کیونکہ ہر دو اپنی ہیئت و ساخت کے اعتبار سے طبیعات کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ حسی یا عقلی سطح پر ہم کسی ایسی دنیا سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے جو ماورائے مادہ و شعور ہو۔ چنانچہ عدم علم نفی شے کو لازم نہیں کرتا بلکہ دعویٰ کے اثبات کے لیے کسی اور ذریعۂ علم کو طلب کرتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد ایک ایسے دعویٰ کے ساتھ میدانِ علم و عمل میں آتا ہے جو ہمارے روایتی علوم کی دسترس سے باہر ہے تو پھر لامحالہ اُس شخص پر اپنے دعویٰ کے اثبات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اب اگر وہ استدلال کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جو ہمارے روایتی طریقہ استدلال سے لگا نہ کھاتا ہو تو اُس پر محض اس لیے اعتراض کرنا کہ ہمارے روایتی ذرائع علم سے آپ ہٹ کر بات کرتے ہیں، غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو دعویٰ ہی اس نوعیت کا ہے جو ہمارے ذرائع علمی کی کمی و کمزوری کے بعد سامنے آیا۔ اگر روایتی ذرائع علم سے اُس حقیقت کا ادراک ممکن ہوتا تو پھر کسی نئے ذریعۂ علم کی طلب ہی پیدا نہ ہوتی۔ چنانچہ کوئی بھی صاحبِ عقل و فہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مابعد الطبیعاتی اصول و قوانین کے دعویٰ دار محض ہماری روایتی سوچ و فکر کے حوالے سے غلط ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عقل سے ماورا ہونے کے باعث عقل اُنھیں قبول کرنے سے گریزاں ہو۔ چنانچہ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس نوع کے دعویٰ دار حضرات، عقل و فکر پر کسی جبر و اکراہ کو لازم نہیں کرتے بلکہ یہ نفی و اثبات کا رویہ، آزادیٔ ارادہ و اختیار کو لازم کرتا ہے اور پھر یہ خود اس فکر کی اپنی داخلی مجبوری ہے کہ اگر عقل و شعور آزاد و مرضی سے رد نہ کر سکیں تو ان (عقل و شعور) پر وہ احکام مرتب نہیں ہو سکتے جن کو لازم کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو مابعد الطبیعاتی فکر کے حاملین کو مادی قوانین کے برعکس حاصل ہے۔

آزادیٔ ارادہ کی اس روش سے بہرحال ایک اَور ذمہ داری جنم لیتی ہے اور وہ فرد کو ایک ذمہ دار وجود کی حیثیت سے شناخت کرتی ہے۔ اب یہ فرد پر لازم ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی فکر کے حاملین کے دعویٰ کو قبول کرے یا رَد کرے۔ کوئی تیسرا رویہ ممکن نہیں۔

رَدوقبول کے اثرات بھی فوری اظہار نہیں کرتے اور نہ یہ اس فکر کے دعویٰ داروں کا دعویٰ ہے، وہ اپنے مخاطبین کو نہایت واضح انداز میں اُن کے رویے کے نتائج پر خبردار کردیتے ہیں اور یقیناً یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جس کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ نتائج جو اس فکری رویے کو رَد کرنے پر رونما ہونے کا عندیہ دیا جاتا ہے، غیر معمولی ہیں۔ لہٰذا ایک ذمہ دار وجود کبھی اس کو رَد کرنے میں جلدی نہیں کرے گا۔ کیونکہ عقل منطق کسی حیات مابعد کی کم از کم امکانی حیثیت کو رَد کرنے کی پوزیشن میں نہیں جبکہ اس کا اثبات زیادہ عقلی ہے کہ ''غیب'' کو محض حس و ادراک کے حوالے سے رَد کرنا شعور کو 'حس' سے رَد کرنے کے مترادف ہے۔

بیچارہ پروفیسر خاموش ہوگیا:

ایک لطیفہ ملاحظہ ہو:

''کہتے ہیں کہ ایک کلاس میں ایک پروفیسر صاحب فرمارہے تھے کہ خدا کو ماننا قدیم زمانے کی جہالت ہے، موجود، مشہود ومحسوس ہوتا ہے، مثلاً دیکھیے کہ کمرہ، میز، کرسیاں، پنکھے، ہر شے موجود ہے اور نظر آرہی ہے۔ اگر خدا موجود ہوتا تو ضرور نظر آتا۔ طلباء حیرت سے پروفیسر صاحب کو تکے جارہے تھے کہ ایک منچلا کھڑا ہوا اور کہا، سر! آپ کہتے ہیں جو شے موجود ہوتی ہے نظر آتی ہے، پروفیسر صاحب نے کہا، بالکل۔ طالب علم بولا سر! مجھے آپ عقل سے خالی نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ میں عقل ہے تو ذرا کلاس کو دکھادیں! پروفیسر صاحب...... بے چارے!''

سائنسی، فلسفی فکر، مگر سرگرداں!

حقیقت یہ ہے کہ دیکھ کر ماننے یا حس وادراک کو معیار بنانے یا طبعی کو مابعدالطبیعی کے اصول سے جانچنے یا تخلیق کو بغیر خالق کے ماننے یعنی اصول خودبخود یا اتفاق (By Chance)، حیات وکائنات کے لیے ایسے مفروضہ اور غیر عقلی، غیر منطقی اصول ورویے کہاں تک چلیں گے۔ 25لاکھ انواع اور لاکھوں کہکشاں، اربوں کھربوں

ستارے وسیارے خود بخود، خود بخود ــــــ یہ پھیلتی کائنات، یہ نظم وتسلسل خود بخود، جبکہ ایک "سوئی" کو وہ خود بخود نہیں مانتا اور پھر سوال کرتا ہے کہ "اللہ" خود بخود کیسے؟

ویسے تو یہ نہایت عقلی رویہ ہوگا کہ انسان لاکھوں مقدس انسانوں کی متفقہ گواہی پر "خود بخود" کے اس تصور کو مان لے۔ کیونکہ لاکھوں انسان زمان ومکان کے بُعد واختلاف کے باوجود جو ایک بات ہی کہتے چلے آتے رہے تو وہ سچے ہیں، جھوٹ پر کبھی اتنا بڑا اجماع نہیں ہوسکتا، آخر وہ دو انسانوں کی گواہی پر عدالت کے "موت" ایسے بڑے فیصلے کو بھی تسلیم کرلیتا ہے، یہ ایک خود بخود...... لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں "خود بخود" سے نجات دلاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مگر وہ اصرار کرے تو پھر فلسفہ اُس کی تشفی کے لیے ایک اصول دیتا ہے کہ "تسلسل باطل ہے" یعنی آپ لامتناہی طور پر ماضی میں نہیں جاسکتے، کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس اللہ کو ایک اور اللہ نے اور اُسے ایک اور اللہ نے پیدا کیا تو پھر یہ لامتناہی تسلسل، ابتدا کو جگہ نہیں دیتا، چنانچہ کسی ابتدا کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ انسان "ازل" کو بن دیکھے تسلیم کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے بغیر آگے کیسے بڑھے یا اگر وہ ریاضی میں 1 کو تسلیم نہ کرے تو پھر 2، 3، 4...... کا سفر شروع ہی نہیں ہوسکتا۔ یہاں انسان یہ سوال نہیں کرتا کہ "ایک" سے پہلے کیا ہے؟ کیونکہ وہ اِس سے ذہنی مناسبت قائم کرچکا ہے، وہ "ازل" کو مانتا ہے کہ اُس کے سامنے موجود ازل کے ہونے پر دلیل ہے، وہ گھڑی ساز کے ہاتھ میں کھلی ہوئی پیچیدہ مشین کو دیکھ کر کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ "گھڑی" خود بخود بن گئی ہوگی تو کیا انسان ایسی "پیچیدہ ترین مشین" جو ابھی تک (Un Known) ❶ قرار دی گئی ہے، خود بخود وجود میں

❶ (Man the Unknown) کی تصدیق بھی جولائی ۲۰۱۳ء میں برطانیہ یونیورسٹی نوٹنگھم (Nottingham) کے ایک پروفیسر مہندر سنگھ ڈوا نے کردی، ابھی تک ماہرین چشم کی تحقیق تھی کہ آنکھ کی پتلی (Cornea) میں جھلیوں کی تعداد پانچ ہے، یاد رہے کہ ایک جھلی (0.001-mm) یعنی ملی میٹر کا ⇦⇦

آ گئی اور پھر مادہ جو ارادہ و شعور سے عاری غایت و نصب العین سے ناآشنا، ایک اندھے ارتقا میں کسی ''شعوری نصب العینی وجود'' کو تخلیق کرنے کا باعث ہو سکتا ہے، چنانچہ ''انسانی وجود'' اپنے خالق پر دلالت کرتا ہے اور ''خالق'' کو موجود تصور کیا جاتا ہے، اس کے خلق ہونے کا سوال نادانی ہے۔

ایک پیچیدگی جو فہم انسانی سے بالاتر:

فلسفہ میں بھی ہمیشہ علت العلل یا علت اولیٰ (First Cause) کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ یہ علمِ وحی کے بغیر، انسانی ذہن کی مجبوری تھی کہ وہ تخلیق کے تسلسل کو ماضی میں کسی اصول اول پر منتج کرے کیونکہ اس کے بغیر، مستقبل کا سفر ممکن نہ تھا، چنانچہ اصولِ اول کو جیسا کہ بتایا گیا مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا، مگر علتِ اولیٰ کا یہ تصور منطقی اعتبار سے درست نہیں کیونکہ علت (Cause) کا کوئی معلول (Effect) ہے تو پھر اِس سلسلہ کو روکا نہیں جا سکتا کہ پھر علت، معلول کو طلب کرتی ہے، ہر دو میں لزوم ہے، اب اگر کائنات (معلول) کی علت (خدا) قرار دی جائے تو پھر علت و معلول کے قانون کے لیے تو یہاں بھی کوئی اور علت ہو یعنی خدا کے لیے کوئی اور علت (وجہ)، چنانچہ مجبوراً ''علت اوّلیٰ'' کا تصور لایا گیا اور تسلسل کو باطل قرار دیا گیا۔

علت و معلول کے قانون میں دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ حادث (جو پہلے نہ ہو بعد میں موجود ہو) کی علت بھی حادث ہوتی ہے، حادث کی علت قدیم نہیں ہو سکتی۔ کائنات چونکہ حادث ہے لہٰذا اگر ''خدا'' کو اس کی علت تصور کیا جائے تو وہ بھی حادث ہوگا جبکہ یہ خلافِ واقعہ ہے۔ قِدمِ مادہ (مادہ قدیم ہے) کا تصور بھی فلسفہ اور سائنس دونوں میں دم توڑ

⇐⇐ سوال حصہ ہوتی ہے۔ پروفیسر مذکور نے چھٹی جھلی دریافت کر کے میڈیکل سائنس میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی کر دی اور دریافت کے عمل کی عدم تکمیل کا بھی ثبوت مل گیا۔ نو دریافت جھلی کو (Dua's Layer) کا نام دیا گیا۔ گویا یہ پروفیسر صاحب سے منسوب ہو گئی۔

چکا ہے، توانائی (Energy) بھی قدیم نہیں، چونکہ حقیقت نہ مادہ ہے نہ توانائی۔ ❶

حقیقت ''اللہ'' ہے اور یہ ایک ایسا وجود مطلق ہے جو اساسی طور پر ہر طرح کے تغیر وتبدیلی، نقص وعیب اور کمی وکمزوری سے پاک اور منزّہ ہے۔ وہ ازل وابد اور زمان و مکان سے ماورا ہے بلکہ ہر شے موجود کا اپنے علم اور قدرت سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ شعور، ارادہ و اختیار کا حامل اور غیر مادی وجود ہے جس کا احاطہ انسانی شعور وادراک نہیں کرسکتے۔ ہاں وہ اُسے اثر سے پہچان سکتے ہیں مگر اُس نے انسان کو اس زحمت سے نکالنے کے لیے اپنے ہونے کی اطلاع اپنے منتخب کردہ افراد سے دلوائی۔ نیز انسان کو اپنی مرضی و منشا سے بھی آگاہ کردیا اور اپنی خاص عنایت سے انسان کو یہ استعداد بھی بخشی کہ وہ بن دیکھے اُسے قبول کرسکے۔

دل سن کے ترا نام دھڑکتا ہے ادب سے
حالانکہ تجھے آنکھ نے دیکھا بھی نہیں ہے

حیات و کائنات، اُس کے شعور کا پرتو ہیں جو ایک خاص زمانی مدت (ایام ستہ) میں بتدریج، شعور سے گیسی مادوں اور پھر ٹھوس مادہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ ایٹم کے انقسام

---

❶ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اصولِ علت ومعلول جسے گویا سائنسی خیال کہا جاتا ہے اور مشاہدہ بھی اِس کی تصدیق کرتا ہے، مادہ (Matter) تحلیلی عمل میں آخر آخر میں، اس اصول سے خود ہی دست بردار ہوتا نظر آتا ہے۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ لکھتے ہیں:

''جوہر ہمیشہ کسی مستقل حالت میں نہیں رہتا۔ وہ یا تو خارج سے توانائی کو جذب کرتا رہتا ہے یا اپنی توانائی کے اشعاع میں مشغول رہتا ہے۔ جب اول الذکر عمل جاری ہو تو ایک برقیہ اندرونی مدار سے چھلانگ لگا کر ایک بیرونی مدار پر پہنچ جاتا ہے...... ان چھلانگوں (طفروں) کا ایک اور نرالا خاصہ یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کب اور کیوں واقع ہوتی ہیں؟ فی الحال جہاں تک ہمارا علم رہبری کرتا ہے حقیقت اِس قدر ہے کہ وہ چھلانگیں بلاتعلیل ہی ہیں ...... پروفیسر شروڈینگر...... کہا تھا کہ ''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بے نہایت چھوٹی اکائیوں میں سے ہر ایک کی وجوبی قانون کی زد سے باہر اپنے اپنے راستے پر لگی ہوئی ہے......''

اور توانائی میں تبدل نے شعور کی اولیت پر دلیل قائم کردی ہے۔ ❶

حقیقت کی یہ تشریح وتعبیر، پوری مابعد الطبیعیات کو لازم کرتی ہے اور حیات کو ایک ایسے ابدی تسلسل میں شناخت کرنے سے عبارت ہے۔ جس کا کوئی اختتام نہیں۔

بقول میر تقی میر: ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾﴾ ❷

''اللہ خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود (الٰہ) نہیں اور فرشتے اور تمام اہلِ علم بھی (یہی گواہی دیتے ہیں) وہ عدل و انصاف سے قائم رکھنے والا ہے، اُس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق (الٰہ) نہیں۔''

****

❶ ضمنی طور پر کارل مارکس کی یہ بات بھی درست نہ رہی کہ ہیگل (جرمن فلسفی) کے فلسفہ میں انسان الٹا (سر کے بل) کھڑا تھا میں نے اُسے سیدھا کھڑا کردیا، یعنی پہلے مادہ وجود میں آیا اور پھر اُس سے شعور نے جنم لیا۔

❷ آل عمران: ۳/ ۱۸.

مثالی مسلمان مرد

- ایک مرد ایک مثالی مسلمان مرد کیسے بن سکتا ہے؟ کہ ہر جگہ اس کی راہوں میں آنکھیں بچھائی جائیں، اس کی بات مان کر خوشی محسوس کی جائے۔
- ایک مثالی مرد اپنے رب کو کیسے مناتا ہے؟ کہ ہر دکھ و تکلیف سے اپنے پروردگار کی مدد پا کر نجات پا جائے۔
- مثالی مسلمان مرد اپنی ذات کو دوسروں کے سامنے کس طرح پیش کرتا ہے؟ کہ اس کے عزت و وقار میں اضافہ ہی اضافہ ہو۔
- مثالی مرد اپنے والدین سے کس طرح کا سلوک کرتا ہے؟ کہ لوگ عش عش کر اٹھیں۔
- مثالی مرد کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ جو اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ضامن ٹھہرے۔
- مثالی مرد اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتا ہے؟ کہ جو بڑھاپے میں اس کے لیے سکون کا جھونکا ثابت ہو۔
- مثالی مرد کا تعلق اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ کہ جس سے گھر رشک چمن بن کر مہک اٹھے۔
- مثالی مرد کا تعلق اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ جو خاندان بھر میں اس کو بہر بلند کردے۔
- مثالی مرد کا تعلق اپنے قرب و جوار میں محلے داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ کہ جو پڑوس سے ہی اس کے مددگار و غمگسار پیدا کرنے کا باعث بنے۔
- مثالی مرد کا تعلق اپنے دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ کہ جو اس کے متعلق ہر سو نیک نامی کی خوشبو بانٹتے پھریں۔
- مثالی مرد کا تعلق و رابطہ اپنے معاشرے کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ کہ جس کی بنا پر وہ اس کا آئیڈیل و رہنما اور قابل تعظیم ہستی بن جائے۔

اگر آپ یہ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں!!
اگر آپ بھی معاشرے کے مثالی فرد بننا چاہتے ہیں ... کہ جس کی ہر جگہ عزت ہو.... اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو اپنا آئیڈیل بنائیں۔ یوں آپ دنیا میں بھی کامیاب و کامران ہوں اور آخرت میں جنتوں کے وارث بن سکیں تو آج ہی اپ "کتاب مثالی مسلمان مرد" کا مطالعہ خود بھی کریں، اپنے بچوں، بھائیوں اور دوستوں کو بھی کروائیں۔
یقیناً آپ دنیا و آخرت میں آئیڈیل بن جائیں گے۔ ان شاء اللہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

توحید اور پیامبر توحید

دارالابلاغ

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ